جُمادی الاولیٰ ۱۴۴۰ھ
جنوری ۲۰۱۹ء

ماہنامہ میثاق لاہور

یکے از مطبوعات

تنظیمِ اسلامی

بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

- ریاستِ مدینہ اور پاکستان
- زوالِ اُمّت کے اسباب اندرونی ہیں!
- نسوانیتِ زن کا نگہباں ہے فقط مَرد

محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ
کے شہرۂ آفاق دورۂ ترجمہ قرآن پر مشتمل

بیانُ القرآن

ترجمہ و مختصر تفسیر

خاص ایڈیشن

دیدہ زیب ٹائٹل ○ امپورٹڈ آفسٹ پیپر ○ بڑے سائز میں
○ عمدہ طباعت ○ مضبوط جلد

سات جلدوں پر مشتمل

مکمل سیٹ کی قیمت: 4000 روپے

عوامی ایڈیشن

کتابی سائز ○ پیپر بیک بائنڈنگ ○ امپورٹڈ بک پیپر
○ عمدہ طباعت ○ دیدہ زیب ٹائٹل

چھ جلدوں پر مشتمل

مکمل سیٹ کی قیمت: 2200 روپے

مکتبہ خُدّام القرآن لاہور
K-36، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون: (042)35869501-3

وَاذۡکُرُوۡا نِعۡمَۃَ اللّٰہِ عَلَیۡکُمۡ وَمِیۡثَاقَہُ الَّذِیۡ وَاثَقَکُمۡ بِہٖۤ ۙ اِذۡ قُلۡتُمۡ سَمِعۡنَا وَاَطَعۡنَا ۫ (المائدۃ:۷)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!

ماہنامہ میثاق لاہور

ڈاکٹر اسرار احمد

جلد : 68

شمارہ : 1

1440ھ

2019

فی شمارہ -/40

مُدیر
حافظ عاکف سعید

نائب مُدیر
حافظ خالد محمود خضر

سالانہ زرِ تعاون

اندرون ملک	400 روپے
بھارت و بنگلہ دیش	900 روپے
ایشیا' یورپ' افریقہ وغیرہ	1200 روپے
امریکہ' کینیڈا' آسٹریلیا وغیرہ	1500 روپے

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ خدام القرآن لاہور

مقام اشاعت: 36۔ کے ماڈل ٹاؤن' لاہور 54700 ' فون: 3-35869501
فیکس: 35834000' ای میل: maktaba@tanzeem.org
ای میل برائے ادارتی امور: publications@tanzeem.org
ویب سائٹ ایڈریس: www.tanzeem.org
مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: "دارُالاسلام" ملتان روڈ چوہنگ لاہور
(پوسٹل کوڈ 53800) فون: 79-35473375 (042)
پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

عرضِ احوال — 5

زوالِ اُمت کے اسباب اندرونی ہیں بیرونی نہیں! — ادارہ

بیانُ القُرآن — 9

سورۃ صٓ (آیات ۱ تا ۲۹) — ڈاکٹر اسرار احمدؒ

سیاست و ریاست — 25

ریاستِ مدینہ اور پاکستان — شجاع الدین شیخ

دعوت و عزیمت — 42

وَلَا تَتَّبِعۡ اَهۡوَآءَ هُمۡ — انجینئر محمد رشید عمر

انوارِ ہدایت — 47

کرو مہربانی تم اہلِ زمیں پر! — پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

گوشۂ خواتین — 55

نسوانیتِ زن کا نگہباں ہے فقط مرد — بیگم ڈاکٹر عبدالخالق

افکار و آراء — 63

شیطانی جال میں پھنسی انسانیت — شہباز رشید بہورو

فقہ و اصولِ فقہ — 67

اصلی اور فرعی مسائل میں مخالفین کے ساتھ برتاؤ کے فقہی ضابطے (۴) — ڈاکٹر احمد بن سعد الغامدیؒ

یادِ رفتگاں — 83

مولانا محمد منظور نعمانیؒ اور ابا جی (۲) — پروفیسر حافظ قاسم رضوان

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

زوال اُمت کے اسباب اندرونی ہیں بیرونی نہیں!

جارح صہیونی افواج نے بیت المقدس میں ایک فلسطینی لڑکی کو گولیاں مار کر شہید کر دیا۔ اس فلسطینی لڑکی پر الزام تھا کہ اس نے دو صہیونی فوجیوں پر حملہ کر کے انہیں زخمی کر دیا تھا۔ اس الزام پر اس کے خلاف نہ مقدمہ درج ہوا' نہ عدالت میں کوئی کیس چلا' نہ کوئی گواہ' نہ ثبوت' کچھ نہیں دیکھا گیا۔ بس سیدھے گولیاں ماریں اور موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ اسی طرح کشمیر سے جو خبریں کسی نہ کسی ذریعے سے بمشکل دنیا تک پہنچتی ہیں ان میں بھی اسی سفاکی اور جارحیت کی نئی نئی مثالیں روز قائم ہوتی ملتی ہیں۔ ایک دو ماہ کی معصوم کشمیری بچی کو اس کی ماں ہسپتال کے بیڈ پر گود میں لیے بیٹھی ہے' بچی کی ایک آنکھ پر سفید پٹی بندھی ہے اور اس کی ماں کرب اور اضطراب کی کیفیت میں کبھی اس معصوم بچی کی طرف دیکھتی ہے اور کبھی آس پاس کھڑے لوگوں کو بے بسی کی حالت میں دیکھتی ہے۔ اس کے چہرے پر تفکّرات اور حیرانی کے آثار اس کی زبان پر نہ آنے والے کئی سوالات کی عکاسی کرتے ہیں' جیسے وہ پوچھ رہی ہو کہ اس ننھی سی معصوم جان کا کیا قصور تھا؟ کیوں پیلٹ گن سے اس کی بینائی چھین لی گئی؟ کیا صرف مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہونا ہی اس کا جرم ہے؟

آج دنیا میں ۵۸ مسلم ممالک ہیں جن میں اُمت کا درد رکھنے والے طیب اردگان کا ترکی اور ایٹمی صلاحیت رکھنے والا پاکستان بھی شامل ہے۔ لیکن اس کے باوجود دنیا بھر میں مسلمانوں کی یہ حالت ہے کہ انہیں بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح کیا جا رہا ہے' چیونٹیوں کی طرح کچلا جا رہا ہے اور گھاس پھونس کی طرح روندا جا رہا ہے۔ کسی غیر مسلم کا چاہے کتنا ہی بڑا جرم کیوں نہ ہو اُسے بچانے کے لیے تمام غیر مسلم قوتیں متحرک ہو جاتی ہیں۔ جیسے آسیہ جیسی گستاخِ رسول کو بچانے کے لیے تمام عالمی طاقتیں یکسو ہو گئیں۔ جبکہ دوسری طرف بے قصور عافیہ صدیقی اغیار کی قید میں سلاخوں کے پیچھے موت کی منتظر ہے' لیکن کسی مسلم ملک' بڑے سے بڑے مسلم لیڈر کی غیرت و حمیت نہیں جاگی۔ غزہ کے محصور مسلمان اُمتِ مُسلمہ کی اسی بے حسی اور بے حمیتی کو دیکھتے ہوئے تنگ آ کر اب دیواروں سے سر پھوڑنے کے مترادف ہر جمعہ کو ''واپسی مارچ'' کے نام سے اپنے آبائی علاقے کا رخ کرتے ہیں جہاں پر ان کا سامنا قابض صہیونی افواج کی گولیوں' شیلوں اور بموں سے

ہوتا ہے۔ مارچ ۲۰۱۸ء کے بعد سے اب تک واپسی مارچ میں ۳۰۰ کے لگ بھگ فلسطینی شہید اور کئی ہزار زخمی ہو چکے ہیں۔ ان کا قصور صرف اتنا ہے کہ وہ اپنی زمینوں اور جائیدادوں پر ناجائز صہیونی قبضہ کے خلاف احتجاج کرتے ہیں۔ جارح اسرائیلی افواج تلاشی کے نام پر جس گھر میں چاہیں زبردستی گھس جائیں اور مسلم عورتوں کے پردے' تقدس کو پامال کرتے ہوئے ان کے بال نوچیں۔ چھوٹی چھوٹی مسلمان بچیاں جن کے گڑیوں سے کھیلنے کے دن تھے' جارح اسرائیلی فوجیوں سے اُلجھتی' تکرار کرتی نظر آتی ہیں۔ فلسطینی عورتیں اپنے سہاگ بچانے کی کوشش میں اپنے مَردوں کے ساتھ گھسٹتی چلی جاتی ہیں' مگر کسی بھی اخلاقی حس سے محروم صہیونی فوجی بغیر کسی ثبوت اور قانونی پراسیس کے فلسطینیوں کو گھسیٹ گھسیٹ کر عقوبت خانوں اور ٹارچر سیلوں میں پہنچا رہے ہیں' جہاں ان کے ساتھ اس قدر گھناؤنا اور غیر انسانی سلوک کیا جا رہا ہے جس کو بیان کرنا بھی اخلاقی تقاضوں کے منافی لگتا ہے۔ یہاں تک کہ نوجوان فلسطینی لڑکیوں کو بے پردہ کر کے تفتیش کے نام پر ٹارچر کیا جاتا ہے۔

اس قدر وحشت اور درندگی کا بازار گرم ہے کہ انسانیت شرمسار ہو گئی۔ ہالینڈ جیسے غیر مسلم ملک نے اس اسرائیلی وحشت کے خلاف اقوام متحدہ میں قرارداد پیش کی جسے غیر مسلم اکثریت نے پاس بھی کیا۔ لیکن کسی مسلم ملک کو یہ توفیق نہیں ہوئی کہ بے گناہ مسلمانوں پر اس قدر ظلم و جبر کے خلاف آواز اُٹھائے' بلکہ اس کے برعکس تمام عرب ممالک فلسطینیوں کے خلاف اسرائیل کا ساتھ دیتے نظر آتے ہیں اور بعض تو آئندہ ایک صدی کے صہیونی منصوبے کی مکمل حمایت بھی کرتے نظر آتے ہیں۔ ''صدی کی سب سے بڑی ڈیل'' کے عنوان سے یہ منصوبہ ٹرمپ کے یہودی داماد اور مشرق وسطیٰ میں امریکی ایلچی جیسن گرین بلاٹ (جو کہ آرتھوڈاکس یہودی ہے) کے عزائم کا مظہر ہے جس کے مطابق یوروشلم کو اسرائیلی دارالخلافہ تسلیم کیا جائے گا' علاقے میں اسرائیل کی عسکری بالادستی کو تسلیم کیا جائے گا' جبکہ اسرائیل مخالف مزاحمتی گروہوں کو ہر قسم کے اسلحہ سے خالی کیا جائے گا۔ دنیا کے وہ تمام ممالک جنہوں نے ابھی تک اسرائیل کو تسلیم نہیں کیا ہے انہیں اسرائیل کو ایک قانونی ملک کے طور پر تسلیم کرنا ہوگا۔ یوروشلم میں مقدس مقامات کی زیارت یا عبادت کی اجازت اسرائیل کی طرف سے جاری کی جائے گی۔

ہم کہتے ہیں یہود و نصاریٰ ہمارے دشمن ہیں جب کہ چین سے ہماری دوستی ہمالیہ سے بلند اور سمندر سے گہری ہے۔ لیکن عالمی ذرائع ابلاغ کے مطابق چائنا میں مسلم آبادی والا صوبہ سنکیانگ مسلمانوں کے لیے اوپن ایئر جیل بن چکا ہے' جہاں مسلمان قیدیوں کی سی زندگی گزارنے

پر مجبور ہیں۔ سنکیانگ میں جگہ جگہ لگے پبلک سائن بورڈ خبردار کرتے ہیں کہ کسی کو بھی کسی عوامی جگہ پر نماز پڑھنے کی اجازت نہیں ہے۔ مساجد میں ہر نمازی کی الیکٹرانک شناخت ہوتی ہے اور خوف کے مارے مساجد نمازیوں سے خالی ہوتی جارہی ہیں۔ صوبے کے نئے قوانین کے مطابق کوئی بھی شہری ۵۰ برس کی عمر کو پہنچنے سے قبل داڑھی نہیں رکھ سکتا' عورتیں گھر سے باہر پردہ نہیں کرسکتیں اور مسلمان سرکاری ملازمین کے لیے رمضان میں روزہ رکھنا بھی قانوناً منع ہے۔ یہاں تک کہ حلال خوراک بیچنے والے ریستوران بھی بند کیے جارہے ہیں۔ اسکولوں میں مسلم طلبہ و طالبات کا ایک دوسرے کو السلام علیکم یا وعلیکم السلام کہنا بھی بُرا خیال کیا جارہا ہے کیونکہ چینی حکومت کے خیال میں یہ اسلامی الفاظ بھی اسلامی بنیاد پرستی کی علامت ہیں۔ بات ان پابندیوں تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ چینی سکیورٹی فورسز جب چاہیں کسی بھی مسلمان مرد یا عورت کو اُٹھا کر لے جائیں۔ خود اقوام متحدہ کے اعداد و شمار کے مطابق سنکیانگ کے دس لاکھ سے زائد مسلمان اس وقت چینی ٹارچر سیلوں (نام نہاد تربیتی مراکز) میں زندگی اور موت کی کشمکش میں ہیں اور ان کے عزیز رشتہ دار بھی کسی کم عذاب میں مبتلا نہیں ہیں۔ ان ٹارچر سیلوں میں تشدد کے ذریعے مسلمانوں کی مذہبی اور معاشرتی اقدار کو بدلنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ امریکی کانگریس کے سامنے ایک ایغور مسلم خاتون نے اعتراف کیا کہ اسے گنجا کر کے بجلی کے جھٹکے لگائے جاتے تھے جس کی وجہ سے وہ سماعت سے محروم ہوگئی۔ اس نے بتایا کہ ان ٹارچر سیلوں میں کئی خواتین موت کے منہ میں چلی جاتی ہیں یا پھر وہ ساری زندگی کے لیے اولاد کی نعمت سے محروم ہو جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ اس خاتون نے بتایا کہ ان ٹارچر سیلوں میں چینی سکیورٹی فورسز کے لوگ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی شان میں بھی نازیبا الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ مغرب اس ایشو کو تو اُٹھا رہا ہے مگر خود اپنے گریبان میں نہیں جھانکتا کہ مغرب اور امریکہ میں مسلمانوں کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ عالمی میڈیا کا یہ دہرا معیار اسرائیل اور بھارت کی ریاستی دہشت گردی سے صرفِ نظر کرنے سے بھی ظاہر ہو رہا ہے۔

آج اُمت کی ایسی حالت کیوں ہے؟ ہمارے دانشور جتنی بھی دور تک اپنی دانش کے گھوڑے دوڑا لیں مگر آخر میں تان مسلم حکمرانوں کی بے حسی پر ٹوٹتی ہے یا زیادہ سے زیادہ مسلم حکومتوں کی مجبوریاں گنوا کر خاموش ہو جاتے ہیں' مگر حقیقت میں یہ بے حسی ہے اور نہ کوئی مجبوری کا شاخسانہ' بلکہ اصل میں ہماری وفاداریاں بدل چکی ہیں۔ آج ہم عرب ہیں' ایرانی ہیں' پاکستانی ہیں' عراقی ہیں' مصری ہیں' لبنانی ہیں' افغانی ہیں' لیکن مسلم اُمت نہیں ہیں۔ اسی طرح ہم شیعہ ہیں' سُنّی ہیں' وہابی ہیں' دیوبندی ہیں' بریلوی ہیں' ہماری سب وفاداریاں اپنے اپنے مسلک کے ساتھ

ہیں' لیکن اسلام کے ساتھ نہیں ہیں۔ ہم جسے اپنا ملکی مفاد کہتے ہیں وہ اُمت کی بربادی کا سامان بھی ہوسکتا ہے' لیکن یہ جانتے ہوئے بھی ہم ملکی مفاد کے نام پر اُمت کا نقصان کرنے سے گریز نہیں کرتے۔ اسی ملکی مفاد کے نام پر ہم نے دشمن قوتوں کے ساتھ مل کر پڑوسی مسلمان ملک میں اسلامی حکومت کا خاتمہ کر دیا اور اپنے پڑوسی مسلمانوں کے خلاف امریکی جنگ میں شریک ہوگئے۔ اسی طرح عرب کا جو مفاد ہے اُسے ایران اپنا نقصان سمجھتا ہے اور جو ایران کا مفاد ہے وہ عربوں کے نزدیک ان کا نقصان ہے۔ بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر ہم اپنے مفاد کے لیے اپنے ہی مسلم بھائیوں کا خون بہانے سے بھی دریغ نہیں کر رہے۔ یہ خون چاہے یمن میں بہہ رہا ہو' شام میں یا عراق میں' اُمت کا ہی خون ہے' لیکن اپنے ہی یہ خون بہا رہے ہیں۔ جب ہم آپس میں ہی ایک دوسرے کے خون کے اتنے پیاسے ہیں تو پھر دشمن قوتوں سے کیا گلہ؟

ایک صدی قبل اُمت کو اگرچہ دشمنوں نے ہی ٹکڑے ٹکڑے کیا' مگر یہ اس وقت تک ممکن نہیں ہوا جب تک کہ ہمارے اپنے ہی لوگ اس تقسیم و تخریب کے عمل میں ہنسی خوشی شریک نہیں ہوئے اور انہوں نے دشمن قوتوں کے ساتھ مل اس تقسیم کی جنگ نہیں لڑی۔ آج ہم دشمنوں کو کوستے ہیں کہ اُمت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور اُمت کی اسی توڑ پھوڑ کی وجہ سے آج اُمت کی یہ حالت ہے اور اسی وجہ سے برما' فلسطین' کشمیر' سنکیانگ' بہار' آسام میں مسلمانوں کی زندگی عذاب ہو چکی ہے' مگر اس کے باوجود ہم اس تقسیم پر اتنے خوش ہیں کہ ہر سال اس کی یاد میں جشن مناتے ہیں۔ گویا ہم اُمت کی اس بربادی پر اتنے خوش ہیں تو پھر کیسی اُمت اور کیسا اُمت کا درد؟

سچ بات تو یہ ہے کہ جب ہم خود ہی اپنے ساتھ مخلص نہیں ہیں' اپنے ہی مسلمان بھائیوں کے گلے کاٹنے میں اپنا مفاد سمجھتے ہیں' مسلم ریاستیں قومی مفاد کے نام پر دوسری مسلم ریاستوں کی جڑیں کاٹ رہی ہیں' حکمران ذاتی مفاد میں قومی مفادات کا سودا کر رہے ہیں' علماء مسلکی مفادات میں اُلجھ کر اجتماعی دینی مفاد کو نظر انداز کر رہے ہیں' تمام دینی تحریکیں خود اپنے ہی مسلم ممالک میں مزاحمت کا شکار ہیں' اس سے بھی آگے بڑھ کر دین پسندوں پر مسلم ممالک میں ہی شکنجے سخت سے سخت تر ہوتے جارہے ہیں' یہاں تک کہ اسلامی تعلیمات کو نصاب سے بھی نکالا جارہا ہے' تو ان حالات میں ہمیں دشمنوں کی سازشوں اور ان کے ہاتھوں مسلمانوں پر ہونے والے ظلم و ستم کا گلہ کرنے کی بجائے سخت سے سخت تر عذاب کا منتظر رہنا چاہیے' جب تک کہ ہم دوبارہ اسلام سے مخلص ہو کر ایک اُمت بننے کی ضرورت محسوس نہ کرنے لگیں۔

❁❁❁

دورۂ ترجمۂ قرآن

ڈاکٹر اسرار احمد

سُورۃُ صٓ

تمہیدی کلمات

سورۂ صٓ قرآن حکیم کی ان تین سورتوں میں سے ایک ہے جن کا آغاز ایک ''حرفِ مقطعہ'' سے ہوتا ہے۔ باقی دو سورتیں سورۂ قٓ اور سورۂ نٓ ہیں۔ سورۂ صٓ کا تعلق مکی سورتوں کے جس گروپ سے ہے اس میں شامل تمام سورتوں کا مرکزی مضمون ''توحید'' ہے۔ سورۂ قٓ ان دو گروپس کی ابتدائی سورت ہے جن میں شامل سورتوں کا مرکزی مضمون آخرت اور انذارِ آخرت ہے' جبکہ سورۂ نٓ (سورۃ القلم) بالکل ابتدائی دور کی سورت ہے۔

آیات ۱ تا ۱۶

صٓ وَالْقُرْاٰنِ ذِی الذِّکْرِ ۝۱ بَلِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فِیْ عِزَّۃٍ وَّشِقَاقٍ ۝۲ کَمْ اَہْلَکْنَا مِنْ قَبْلِہِمْ مِّنْ قَرْنٍ فَنَادَوْا وَّلَاتَ حِیْنَ مَنَاصٍ ۝۳ وَعَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَہُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْہُمْ ۫ وَقَالَ الْکٰفِرُوْنَ ہٰذَا سٰحِرٌ کَذَّابٌ ۝۴ اَجَعَلَ الْاٰلِہَۃَ اِلٰہًا وَّاحِدًا ۚ اِنَّ ہٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ ۝۵ وَانْطَلَقَ الْمَلَاُ مِنْہُمْ اَنِ امْشُوْا وَاصْبِرُوْا عَلٰٓی اٰلِہَتِکُمْ ۚ اِنَّ ہٰذَا لَشَیْءٌ یُّرَادُ ۝۶ مَا سَمِعْنَا بِہٰذَا فِی الْمِلَّۃِ الْاٰخِرَۃِ ۚ اِنْ ہٰذَآ اِلَّا اخْتِلَاقٌ ۝۷ ءَاُنْزِلَ عَلَیْہِ الذِّکْرُ مِنْۢ بَیْنِنَا ؕ بَلْ ہُمْ فِیْ شَکٍّ مِّنْ ذِکْرِیْ ۚ بَلْ لَّمَّا یَذُوْقُوْا عَذَابِ ۝۸ اَمْ عِنْدَہُمْ خَزَآئِنُ رَحْمَۃِ رَبِّکَ الْعَزِیْزِ الْوَہَّابِ ۝۹ اَمْ لَہُمْ مُّلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

وَمَا بَیْنَہُمَا ۫ فَلْیَرْتَقُوْا فِی الْاَسْبَابِ ۝۱۰ جُنْدٌ مَّا ہُنَالِکَ مَہْزُوْمٌ مِّنَ الْاَحْزَابِ ۝۱۱ کَذَّبَتْ قَبْلَہُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّعَادٌ وَّفِرْعَوْنُ ذُو الْاَوْتَادِ ۝۱۲ وَثَمُوْدُ وَقَوْمُ لُوْطٍ وَّاَصْحٰبُ الْاَیْکَۃِ ؕ اُولٰٓئِکَ الْاَحْزَابُ ۝۱۳ اِنْ کُلٌّ اِلَّا کَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ عِقَابِ ۝۱۴ وَمَا یَنْظُرُ ہٰٓؤُلَآءِ اِلَّا صَیْحَۃً وَّاحِدَۃً مَّا لَہَا مِنْ فَوَاقٍ ۝۱۵ وَقَالُوْا رَبَّنَا عَجِّلْ لَّنَا قِطَّنَا قَبْلَ یَوْمِ الْحِسَابِ ۝۱۶

آیت ۱ ﴿صٓ وَالْقُرْاٰنِ ذِی الذِّکْرِ ۝۱﴾ ''صٓ' قسم ہے اس قرآن کی جو ذکر والا ہے۔''

یہاں پر پہلے حرف یعنی صٓ پر آیت مکمل نہیں ہوئی بلکہ یہ حرف پہلی آیت کا حصہ ہے۔ اسی طرح سورۂ قٓ اور سورۂ نٓ کے آغاز میں بھی ایک ایک حرف ہے اور ان دونوں سورتوں میں بھی ایسا ہی ہے کہ اکیلا حرف پہلی آیت کا حصہ ہے نہ کہ الگ مستقل آیت۔ البتہ کئی سورتوں میں آغاز کے دو حروف پر آیت مکمل ہو جاتی ہے۔ مثلاً طٰہٰ' یٰسٓ اور حٰمٓ مستقل آیات ہیں۔ اس کے علاوہ کئی ایسی سورتیں بھی ہیں جن کے آغاز میں تین تین حروف مقطعات ہیں لیکن وہ حروف الگ آیت کی حیثیت سے نہیں بلکہ پہلی آیت کا حصہ ہیں۔ مثلاً الٓرٰ۔ اس کے برعکس بہت سی سورتوں کے آغاز میں تین حروف مقطعات ایک مکمل آیت کے طور پر بھی آئے ہیں' مثلاً الٓمٓ۔ یہاں ان مثالوں سے دراصل یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ قرآن کے یہ معاملات توقیفی (حضور ﷺ کے بتانے پر موقوف) ہیں' کسی کے اجتہاد یا گرامر کے کسی اصول سے ان کا تعلق نہیں ہے۔ ''بیان القرآن'' کے آغاز میں تعارفِ قرآن کے عنوان کے تحت اس موضوع کی وضاحت کی جا چکی ہے۔

جہاں تک سورۂ صٓ کی پہلی آیت کے مضمون کا تعلق ہے اس میں ''ذکر والے'' قرآن کی قسم کھائی گئی ہے۔ اس سے پہلے ہم کئی ایسی آیات بھی پڑھ چکے ہیں جن میں قرآن کو ''الذِّکر'' یا ''ذِکر'' کہا گیا ہے۔ سورۃ الحجر کی یہ آیت اس حوالے سے بہت اہم ہے: ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝۹﴾ ''یقیناً ہم نے ہی یہ ذکر نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں''۔ سورۃ الانبیاء میں فرمایا گیا: ﴿لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَیْکُمْ کِتٰبًا فِیْہِ ذِکْرُکُمْ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝۱۰﴾ ''(اے لوگو!) اب ہم نے تمہاری طرف یہ کتاب نازل کی ہے' اس میں تمہارا ذکر ہے' تو کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے!'' بہر حال ''ذکر'' کے معنی یاددہانی کے ہیں۔ اس لحاظ سے آیت

زیرمطالعہ میں القرآن ذی الذکر کا مفہوم یہ ہے کہ یہ قرآن یاددہانی (reminding) کا حامل ہے‘ یاددہانی سے معمور ہے۔

قرآن کی قسم کے بارے میں یہاں ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ اس قسم کا ’’مقسم علیہ‘‘ محذوف ہے۔ یعنی ذکر والے قرآن کی قسم کس بات پر کھائی گئی ہے‘ اس کا ذکر نہیں ہے۔ اس نکتہ کی وضاحت قبل ازیں سورۂ یٰسٓ کی آیت ۳ کے تحت یوں کی جا چکی ہے کہ قرآن میں جہاں جہاں بھی قرآن کی قسم کے بعد اس قسم کا مقسم علیہ محذوف ہے‘ ان تمام مقامات پر سورۂ یٰسٓ کی آیت ۳ ہی کو ان تمام قسموں کا مقسم علیہ تصور کیا جائے گا۔ سورۂ یٰسٓ کے آغاز میں قرآن کی قسم اور اس قسم کے مقسم علیہ کا ذکر یوں ہوا ہے: ﴿یٰسٓ ۝۱ وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ۝۲ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝۳﴾ ’’یٰسٓ‘ قسم ہے قرآن حکیم کی (کہ اے محمد ﷺ) یقیناً آپ مرسلین میں سے ہیں‘‘۔ چنانچہ آیت زیرمطالعہ کے بعد بھی اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ کے کلمات کو محذوف مانتے ہوئے پورے جملے کا مفہوم یوں تصور کیا جائے گا: ’’اے محمد (ﷺ) یہ ذکر والا قرآن گواہ ہے کہ آپؐ اللہ کے رسول ہیں۔‘‘

آیت ۲ ﴿بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ عِزَّةٍ وَّشِقَاقٍ ۝۲﴾ ’’لیکن جن لوگوں نے کفر کی روش اختیار کی ہے وہ غرور اور ضد میں مبتلا ہیں۔‘‘

ان لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کے مقابلے میں ضِدم ضِدّا ایک موقف اختیار کر لیا ہے اور اب غرور اور جھوٹی اَنا کی وجہ سے اس پر اڑے ہوئے ہیں۔

آیت ۳ ﴿كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ قَرْنٍ﴾ ’’کتنی ہی قوموں کو ہم نے ان سے پہلے ہلاک کیا ہے‘‘

﴿فَنَادَوْا وَّلَاتَ حِيْنَ مَنَاصٍ ۝۳﴾ ’’تو (عذابِ الٰہی کے وقت) وہ لگے چیخنے چلّانے‘ حالانکہ تب خلاصی کا وقت نہیں رہا تھا۔‘‘

اللہ تعالیٰ کے قاعدے اور قانون کے مطابق کسی شخص کی موت کے آثار ظاہر ہونے کے بعد اس کے لیے توبہ کا دروازہ بند ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جب کسی قوم پر عذاب کے آثار ظاہر ہو جائیں تو اس وقت ان لوگوں کی اجتماعی توبہ انہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔ اس قانون سے پوری انسانی تاریخ میں صرف قومِ یونسؑ کو استثناء ملا تھا‘ جس کا ذکر سورۂ یونس کی آیت ۹۸ میں آیا ہے۔

آیت ۴ ﴿وَعَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ﴾ ’’اور انہیں بڑا تعجب ہوا ہے کہ ان کے پاس آیا ہے ایک خبردار کرنے والا ان ہی میں سے‘‘

﴿وَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا سٰحِرٌ كَذَّابٌ ۝۴﴾ ’’اور کافر کہتے ہیں کہ یہ ساحر ہے‘ کذّاب ہے۔‘‘

یہ بہت سخت الفاظ ہیں‘ لیکن قرآن نے مشرکینِ مکّہ کے قول کے طور پر انہیں جوں کا توں نقل کیا ہے۔ ان الفاظ سے دراصل حضور ﷺ کی مخالفت کی اس کیفیت کا اندازہ ہوتا ہے جو اس سورت کے نزول کے وقت مکہ کے ماحول میں پائی جاتی تھی۔ اس کیفیت کو سمجھنے کے لیے یہ معلومات اپنے حافظے میں پھر سے تازہ کر لیں کہ مکی سورتوں کے پچھلے گروپ کی آٹھ سورتیں (الفرقان تا السجدۃ) اور زیرمطالعہ گروپ کی تیرہ سورتیں (سبا تا الاحقاف) ۴ نبویؐ سے ۸ نبویؐ کے زمانے میں نازل ہوئیں۔ ان میں سے سورۃ الصّٰفّٰت البتہ اس دور کی سورت نہیں ہے۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آیات (پانچ رکوعوں میں ۱۸۲ آیات ہیں اور ایک رکوع میں ۵۳ آیات بھی ہیں) اور تیز ردھم سے صاف پتا چلتا ہے کہ یہ ابتدائی دور کی سورت ہے۔ بہرحال ان سورتوں کا نزول جس دور (۴ تا ۸ نبویؐ) میں ہوا‘ اس دور میں حضور ﷺ کی مخالفت بہت شدت اختیار کر چکی تھی اور اسی نسبت سے آپؐ پر ہونے والے حملوں کی نوعیت میں بھی تبدیلی آ چکی تھی۔ ابتدا میں تو اکثر لوگوں نے آپؐ کی باتوں پر سنجیدگی سے غور ہی نہیں کیا تھا۔ اس لیے اس زمانے میں اگر کوئی شخص آپؐ کی شان میں گستاخی کرتا تو وہ آپؐ کو مجنون وغیرہ کہہ دیتا‘ بلکہ ابتدا میں تو بعض لوگوں کے ہاں اس حوالے سے آپؐ کے ساتھ ہمدردی کا انداز بھی پایا جاتا تھا۔ اُس وقت بعض لوگ تو واقعی سمجھتے تھے کہ غارِ حرا میں راتیں گزارنے کی وجہ سے آپؐ پر کوئی آسیب وغیرہ آ گیا ہے۔ چنانچہ ایک دفعہ عتبہ بن ربیعہ نے آپؐ سے بہت ہمدردی کے انداز میں کہا تھا کہ اے میرے بھتیجے! عرب کے بہت سے کاہنوں اور عاملوں کے ساتھ میرے تعلقات ہیں‘ اگر تم کہو تو میں ان میں سے کسی کو بلا کر تمہارا علاج کرا دوں۔ البتہ جب مشرکینِ مکّہ نے دیکھا کہ وہ آواز جس کو وہ محض ایک شخص کی پکار سمجھتے تھے اب گھر گھر میں گونجنے لگی ہے اور جس تحریک کو انہوں نے ایک مشتِ غبار سمجھ کر نظرانداز کر دیا تھا اب وہ ایک طوفان کا روپ دھار کر ان کے پورے معاشرے کو زیروزبر کرنے والی ہے تو ان کی مخالفت میں بتدریج شدت آتی گئی۔ چنانچہ آیت زیرمطالعہ کے الفاظ (سٰحِرٌ كَذَّابٌ) ایسے ہی شدید

مخالفانہ جذبات کی ترجمانی کرتے نظر آتے ہیں۔

آیت ۵ ﴿اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ ۝۵﴾ ''کیا اس نے تمام معبودوں کو بس ایک معبود بنا دیا؟ یہ تو بڑی عجیب بات ہے!''

جیسا کہ قبل ازیں بھی بتایا جا چکا ہے' زیر مطالعہ گروپ کی ان سورتوں کا مرکزی مضمون توحید ہے جو اس آیت میں بڑے مؤثر اور زوردار انداز میں بیان ہوا ہے۔

آیت ۶ ﴿وَانْطَلَقَ الْمَلَاُ مِنْهُمْ اَنِ امْشُوْا وَاصْبِرُوْا عَلٰٓى اٰلِهَتِكُمْ ۚ اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ یُّرَادُ ۝۶﴾ ''اور چل پڑے ان کے سردار (یہ کہتے ہوئے) کہ چلو جاؤ اور جمے رہو اپنے معبودوں پر' یقیناً اس بات میں تو کوئی غرض پوشیدہ ہے۔''

یہ آیت لفظی تصویر کشی (word picture) کا خوبصورت نمونہ پیش کرتی ہے۔ ان الفاظ کو پڑھنے کے بعد مکہ کے مخصوص ماحول میں ایک مجمع کا نقشہ نگاہوں کے سامنے پھرنے لگتا ہے' جس سے رسول اللہ ﷺ خطاب فرما رہے ہیں۔ مجمع میں عام لوگوں کے ساتھ قریش کے چند سردار بھی موجود ہیں۔ سب لوگ حضور ﷺ کی باتیں بڑے دھیان سے سن رہے ہیں' مگر تھوڑی دیر کے بعد ان کے سردار یہ کہتے ہوئے وہاں سے چل پڑتے ہیں کہ چلو چلو یہاں سے! تم لوگ کہاں کھڑے ہو؟ کس کی باتیں سن رہے ہو؟ کیا ان کے کہنے پر ہم اپنے معبودوں کو چھوڑ دیں گے؟ چھوڑو ان باتوں کو اور جاؤ اپنا اپنا کام کرو! اور سنو' ان باتوں پر سنجیدگی سے غور کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ان سب باتوں کے پیچھے ضرور ان کا کوئی مفاد پوشیدہ ہے۔ یہ دعوت تو اس غرض سے دی جا رہی ہے کہ محمد (ﷺ) یہاں اپنا اقتدار قائم کر کے ہم پر حکم چلانا چاہتے ہیں۔ اس لیے تم اپنے عقائد اور اپنے معبودوں کی پرستش پر مضبوطی سے جمے رہو اور ان باتوں پر دھیان مت دو!

آیت ۷ ﴿مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِی الْمِلَّةِ الْاٰخِرَةِ ۚ﴾ ''ہم نے ایسی کوئی بات پچھلے دین میں تو نہیں سنی ہے۔''

آخر ہمارا بھی اپنا ایک دین ہے جو ہم نے ورثے میں پایا ہے۔ پھر ہمارے باپ دادا کی روایات ہیں جو نسل در نسل ہم تک پہنچی ہیں۔ لیکن ہم نے ایسی باتیں اس سے پہلے نہ تو اپنے باپ دادا کے دین میں سنی ہیں اور نہ ہی پرانی روایات سے ان کی تصدیق ہوتی ہے۔

﴿اِنْ هٰذَآ اِلَّا اخْتِلَاقٌ ۝۷﴾ ''یہ تو نہیں ہے مگر ایک گھڑی ہوئی چیز۔''

اختلاق ''خلق'' سے باب افتعال ہے۔ یعنی یہ کوئی خواہ مخواہ بنائی ہوئی چیز ہے۔

آیت ۸ ﴿ءَاُنْزِلَ عَلَیْهِ الذِّكْرُ مِنْۢ بَیْنِنَا ؕ﴾ ''کیا اسی پر نازل ہوا ہے یہ ذکر ہمارے درمیان؟''

اگر یہ واقعی اللہ کا کلام ہے تو کیا یہ محمد (ﷺ) پر ہی نازل ہونا تھا' کیا اس کے لیے اللہ کو ہمارے بڑے بڑے سرداروں اور سرمایہ داروں سے کوئی ''اعلیٰ شخصیت'' نظر نہیں آئی؟

﴿بَلْ هُمْ فِیْ شَكٍّ مِّنْ ذِكْرِیْ ۚ﴾ ''بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ میرے ذکر کے معاملے میں شک میں پڑ گئے ہیں۔''

﴿بَلْ لَّمَّا یَذُوْقُوْا عَذَابِ ۝۸﴾ ''بلکہ ابھی تک انہوں نے میرے عذاب کا مزہ نہیں چکھا۔''

اصل بات یہ ہے کہ ابھی تک انہوں نے میرے کسی عذاب کی مار نہیں چکھی' اس لیے انہیں میرے اس کلام کے بارے میں شک ہے۔

آیت ۹ ﴿اَمْ عِنْدَهُمْ خَزَآىِٕنُ رَحْمَةِ رَبِّكَ الْعَزِیْزِ الْوَهَّابِ ۝۹﴾ ''کیا ان کے اختیار میں ہیں آپ کے رب کی رحمت کے خزانے؟ جو بہت زبردست' بہت عطا کرنے والا ہے۔''

کیا اللہ کی رحمت کے خزانوں کا اختیار ان لوگوں کے پاس ہے؟ کیا اللہ ان لوگوں سے پوچھنے کا مکلف تھا کہ میں نبوت اور رسالت کے منصب پر کسے فائز کروں؟

آیت ۱۰ ﴿اَمْ لَهُمْ مُّلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَیْنَهُمَا ۖ﴾ ''کیا ان کے پاس ہے بادشاہی آسمانوں اور زمین کی اور جو کچھ ان دونوں کے مابین ہے اُس سب کی؟''

﴿فَلْیَرْتَقُوْا فِی الْاَسْبَابِ ۝۱۰﴾ ''تو چاہیے کہ یہ چڑھ جائیں رسیاں تان کر (آسمان پر)۔''

اگر تمہارے لیے ممکن ہے تو اپنے تمام وسائل و ذرائع بروئے کار لا کر آسمان پر چڑھ جاؤ اور ربّ العالمین کی رحمت کے خزانوں اور اس کے اقتدار و اختیار میں تصرف کر کے دکھاؤ!

آیت ۱۱ ﴿جُنْدٌ مَّا هُنَالِكَ مَهْزُوْمٌ مِّنَ الْاَحْزَابِ ۝۱۱﴾ ''یہ بھی ایک لشکر ہے (پہلے ہلاک کیے گئے) لشکروں میں سے' جو اَب یہاں ہلاک ہوگا۔''

اگلی آیات میں قومِ نوحؑ، قومِ ہودؑ، قومِ لوطؑ، قومِ شعیبؑ اور آلِ فرعون کے عبرتناک انجام کا ذکر ہے۔ مطلب یہ کہ جو روش اختیار کر کے ماضی کی یہ اقوام ہلاکت سے دوچار ہوئیں، وہی روش اب قریشِ مکّہ بھی اپنائے ہوئے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ بھی مذکورہ اقوام جیسے انجام سے دوچار ہونے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔

آیت ۱۲ ﴿كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ وَّعَادٌ وَّفِرْعَوْنُ ذُو الْاَوْتَادِ ﴿۱۲﴾﴾ ''ان سے پہلے جھٹلایا تھا قومِ نوحؑ، قومِ عاد اور میخوں والے فرعون نے۔''

کہا جاتا ہے کہ فرعون جب اپنے لشکروں کے ساتھ سفر کرتا تھا تو گھوڑوں اور خچروں کی ایک کثیر تعداد کو صرف خیموں کے کھونٹے اٹھانے کے لیے مختص کیا جاتا تھا، اس لیے اسے فِرْعَوْنُ ذُو الْاَوْتَادِ کہا گیا ہے۔ اس میں کثرتِ افواج کی طرف اشارہ ہے۔

آیت ۱۳ ﴿وَثَمُوْدُ وَقَوْمُ لُوْطٍ وَّاَصْحٰبُ لْـَٔيْكَةِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ الْاَحْزَابُ ﴿۱۳﴾﴾ ''اور قومِ ثمود، قومِ لوطؑ اور بَن والوں (قومِ شعیبؑ) نے، یہ ہیں وہ (ہلاک ہونے والے) لشکر!''

یعنی یہ تمام اقوام اس سے پہلے اللہ کے رسولوںؑ کو جھٹلا کر ہلاک ہو چکی ہیں۔

آیت ۱۴ ﴿اِنْ كُلٌّ اِلَّا كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ عِقَابِ ﴿۱۴﴾﴾ ''ان سب نے ہی رسولوںؑ کی تکذیب کی، تو وہ میری سزا کے مستحق ہو گئے۔''

آیت ۱۵ ﴿وَمَا يَنْظُرُ هٰٓؤُلَاۗءِ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً مَّا لَهَا مِنْ فَوَاقٍ ﴿۱۵﴾﴾ ''اور یہ لوگ بھی اب منتظر نہیں ہیں مگر صرف ایک چنگھاڑ کے جس میں کوئی وقفہ نہیں ہوگا۔''

ماضی کی کئی اقوام پر اللہ کا عذاب ایک مسلسل تیز آواز اور چنگھاڑ کی صورت میں بھی آیا تھا۔ چنانچہ اگر مشرکینِ مکّہ اپنی ہٹ دھرمی پر اسی طرح قائم رہے تو ایسا ہی کوئی عذاب ان پر بھی آ سکتا ہے۔ آج کی سائنس بھی تصدیق کرتی ہے کہ صوتی لہریں (sound waves) چونکہ انرجی ہی کی ایک قسم ہے، اس لیے ایک انتہائی زوردار آواز کسی بھی مادی نظام کو درہم برہم کرنے اور ماحول میں بڑے پیمانے پر تباہی پھیلانے کا باعث بن سکتی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ اگر کسی قوم کو ہلاک کرنا چاہے تو یہ کام وہ صرف ایک زوردار آواز سے ہی کر سکتا ہے۔

آیت ۱۶ ﴿وَقَالُوْا رَبَّنَا عَجِّلْ لَّنَا قِطَّنَا قَبْلَ يَوْمِ الْحِسَابِ ﴿۱۶﴾﴾ ''اور وہ کہتے ہیں: اے ہمارے رب! ہمارا حصہ تُو ہمیں جلدی دے دے، یومِ حساب سے پہلے۔''

یعنی تو ہمارا حساب روزِ حساب سے پہلے ہی چکا دے! قِطّ کے معنی حصہ بھی ہیں اور یہ حساب کے رجسٹر (چٹھا) کے لیے بھی بولا جاتا ہے، جس میں کسی کاروبار کی آمدن اور خرچ کا سالانہ حساب کتاب لکھا جاتا ہے اور اس سے اس کاروبار کی سالانہ بچت یا نقصان کا پتا چلتا ہے۔

یہ بات مشرکین مکہ استہزائیہ انداز میں کہا کرتے تھے کہ یہ جو محمد (ﷺ) ہمیں ڈراتے رہتے ہیں کہ ہمیں مرنے کے بعد اٹھایا جائے گا، پھر ہمارے ایک ایک عمل کا حساب ہوگا اور اس کے بعد ہمیں سزا دی جائے گی، تو اے ہمارے پروردگار! اس کے لیے یومِ حساب ہی کا انتظار کیوں؟ یہ کام ابھی کیوں نہ ہو جائے! اس لیے بہتر ہوگا کہ تو ہمارا حساب کتاب ابھی کر لے اور ہمارا چٹھا (Balace Sheet) ابھی اسی زندگی میں ہی ہمارے ہاتھ میں تھما دے۔

آیات ۱۷ تا ۲۶

اِصْبِرْ عَلٰي مَا يَقُوْلُوْنَ وَاذْكُرْ عَبْدَنَا دَاوٗدَ ذَا الْاَيْدِ ۚ اِنَّهٗٓ اَوَّابٌ ۝ اِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهٗ يُسَبِّحْنَ بِالْعَشِيِّ وَالْاِشْرَاقِ ۝ وَالطَّيْرَ مَحْشُوْرَةً ۭ كُلٌّ لَّهٗٓ اَوَّابٌ ۝ وَشَدَدْنَا مُلْكَهٗ وَاٰتَيْنٰهُ الْحِكْمَةَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ ۝ وَهَلْ اَتٰىكَ نَبَؤُا الْخَصْمِ ۘ اِذْ تَسَوَّرُوا الْمِحْرَابَ ۝ اِذْ دَخَلُوْا عَلٰي دَاوٗدَ فَفَزِعَ مِنْهُمْ ۭ قَالُوْا لَا تَخَفْ ۚ خَصْمٰنِ بَغٰى بَعْضُنَا عَلٰي بَعْضٍ فَاحْكُمْ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ وَلَا تُشْطِطْ وَاهْدِنَآ اِلٰى سَوَاۗءِ الصِّرَاطِ ۝ اِنَّ هٰذَآ اَخِيْ لَهٗ تِسْعٌ وَّتِسْعُوْنَ نَعْجَةً وَّلِيَ نَعْجَةٌ وَّاحِدَةٌ فَقَالَ اَكْفِلْنِيْهَا وَعَزَّنِيْ فِي الْخِطَابِ ۝ قَالَ لَقَدْ ظَلَمَكَ بِسُؤَالِ نَعْجَتِكَ اِلٰى نِعَاجِهٖ ۭ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْخُلَطَاۗءِ لَيَبْغِيْ بَعْضُهُمْ عَلٰي بَعْضٍ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَقَلِيْلٌ مَّا هُمْ ۭ وَظَنَّ دَاوٗدُ اَنَّمَا فَتَنّٰهُ فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهٗ وَخَرَّ رَاكِعًا وَّاَنَابَ ۝ فَغَفَرْنَا لَهٗ ذٰلِكَ ۭ وَاِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا لَزُلْفٰى وَحُسْنَ مَاٰبٍ ۝ يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ يَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌۢ بِمَا نَسُوْا يَوْمَ الْحِسَابِ ۝

آیت ۱۷ ﴿اِصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ﴾ ’’(اے محمد ﷺ!) آپ صبر کیجیے اس پر جو کچھ یہ لوگ کہہ رہے ہیں‘‘

﴿وَاذْکُرْ عَبْدَنَا دَاوٗدَ ذَا الْاَیْدِ ۚ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ ﴿۱۷﴾﴾ ’’اور آپؐ تذکرہ کیجیے ہمارے بندے داؤد کا جو بہت قوت والا تھا‘ بے شک وہ (اللہ کی طرف) بہت رجوع کرنے والا تھا۔‘‘

آیت ۱۸ ﴿اِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهٗ یُسَبِّحْنَ بِالْعَشِیِّ وَالْاِشْرَاقِ ﴿۱۸﴾﴾ ’’ہم نے تو اس کے ساتھ پہاڑوں کو مسخر کر دیا تھا‘ جو اس کے ساتھ تسبیح کرتے تھے شام کو بھی اور صبح کے وقت بھی۔‘‘

آیت ۱۹ ﴿وَالطَّیْرَ مَحْشُوْرَةً ؕ کُلٌّ لَّهٗۤ اَوَّابٌ ﴿۱۹﴾﴾ ’’اور پرندے بھی‘ جو کہ جمع کر دیے جاتے تھے۔ یہ سب کے سب اُس کی طرف رجوع کرنے والے تھے۔‘‘

یعنی حضرت داؤد علیہ السلام‘ پہاڑ اور پرندے سب اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتے تھے‘ یا یہ کہ پہاڑ اور پرندے حضرت داؤدؑ کی طرف رجوع کرتے تھے اور پھر حضرت داؤدؑ ان سب کے ساتھ اللہ کی طرف رجوع کرتے تھے۔ اس طرح وہ سب مل کر حضرت داؤدؑ کی آواز میں آواز ملا کر اللہ کی حمد کے ترانے الاپتے تھے۔

آیت ۲۰ ﴿وَشَدَدْنَا مُلْکَهٗ وَاٰتَیْنٰهُ الْحِکْمَةَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ ﴿۲۰﴾﴾ ’’اور ہم نے اُس کی حکومت کو خوب مضبوط کیا تھا‘ اور ہم نے اُسے حکمت عطا کی تھی اور فیصلہ کن بات کہنے کی صلاحیت بھی۔‘‘

یعنی ایسی واضح‘ فیصلہ کن اور دوٹوک بات جو تمام مخاطبین و متعلقین کے لیے موجبِ اطمینان ہو۔

اب آگے اس سورت میں چند ایسے واقعات کا ذکر ہونے جا رہا ہے جو مشکلات القرآن میں سے ہیں۔ دراصل ان واقعات کا بیان یہاں اشاروں کنایوں میں ہوا ہے۔ تفصیلات کی تحقیق کے لیے اگر ہم تورات کی طرف رجوع کرتے ہیں تو وہاں ان واقعات کے حوالے سے جو معلومات ملتی ہیں وہ انبیاءِ کرام علیہم السلام کے شایانِ شان نہیں۔ یوں ہمارے لیے شش و پنج کی سی صورتِ حال بن جاتی ہے۔ بہرحال ان واقعات کے مطالعے سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہاں

خطا یا لغزش کا کوئی معاملہ ہوا ہے۔ اس ضمن میں یہ نکتہ اچھی طرح سے سمجھ لینا چاہیے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ تک تمام انبیاء و رسل علیہم السلام معصوم تھے‘ لیکن انسان تھے۔ ایسا نہیں تھا کہ ان میں کبھی غلطی کا رجحان ہی پیدا نہ ہوا ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر وہ فرشتے ہوتے‘ انسان نہ رہتے۔ البتہ اللہ تعالیٰ کے خصوصی بندے ہونے کے سبب تمام انبیاء و رسل علیہم السلام ہر وقت اللہ کی حفاظت میں رہتے تھے۔ خود حضور ﷺ کی زندگی میں ہمیں اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ مثلاً کتب سیرت میں حضور ﷺ کے بارے میں آتا ہے کہ جوانی میں (ظہورِ نبوت سے پہلے) دو مرتبہ ایسا ہوا کہ آپؐ نے کسی میلے میں جانے کا ارادہ کیا۔ عرب میں ہر سال بہت سے ایسے میلے لگتے تھے جن میں فحش گوئی اور لہو و لعب کا سامان بھی ہوتا تھا اور بے ہودہ مشاعرے بھی سجائے جاتے تھے۔ ان میلوں میں عکاظ کا بازار بہت مشہور تھا جو ہر سال خصوصی اہتمام سے سجتا تھا اور اس میں شرکت کے لیے پورے عرب سے لوگ کھنچے چلے آتے تھے۔ روایات کے مطابق آپ ﷺ نے دو مرتبہ ایسے کسی بازار یا میلے میں جانے کا ارادہ فرمایا‘ مگر دونوں مرتبہ ایسا ہوا کہ راستے میں جہاں آپؐ آرام کے لیے رکے‘ وہاں آنکھ لگ گئی اور پھر ساری رات سوتے میں ہی گزر گئی۔ یوں اللہ تعالیٰ نے اس لہو و لعب میں شریک ہونے سے آپؐ کو کلیۃً محفوظ رکھا۔ اگرچہ یہ دونوں واقعات حضور ﷺ کے منصبِ نبوت پر فائز ہونے سے پہلے کے ہیں‘ لیکن ایک نبی تو پیدائشی طور پر ہی نبی ہوتا ہے۔ اس ضمن میں حضور ﷺ کا فرمان ہے: ((کُنْتُ نَبِیًّا وَآدَمُ بَیْنَ الرُّوْحِ وَالْجَسَدِ))(۱) ’’میں اُس وقت بھی نبی تھا جبکہ آدمؑ کی روح ابھی ان کے جسد میں نہیں پھونکی گئی تھی‘‘۔ یعنی عالم ارواح میں بھی حضور ﷺ کی روح مبارک کی ایک خصوصی امتیازی شان تھی۔ بہرحال آپؐ کی نبوت کا ظہور چالیس سال کی عمر میں ہوا لیکن آپؐ بچپن سے ہی براہِ راست اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں رہے اور اس حفاظت کا مطلب یہی ہے کہ بشری سطح پر اگر کبھی کوئی غلط ارادہ پیدا ہو بھی گیا تو اللہ تعالیٰ نے اس پر عمل کی نوبت نہ آنے دی۔

آئندہ آیات میں جس واقعہ کا ذکر ہے اس کی جو تفصیل محرف شدہ تورات میں ملتی ہے اس میں حضرت داؤد علیہ السلام پر بہت شرمناک الزامات عائد کیے گئے ہیں‘ جو عصمتِ انبیاءؑ کے یکسر

(۱) الاجوبة المرضية للسخاوي : ۱۶۷/۱۔ اتحاف الخيرة المهرة : ۸/۷۔ الرد على البكري لابن تيمية : ۶۰۔ مجموع الفتاوىٰ لابن تيمية : ۱۴۷/۲ راوي : ميسرة الفجر رضی اللہ عنہ۔

منافی ہیں۔ قرآن حکیم کے اشارات سے اصل بات یوں معلوم ہوتی ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کی بہت سی بیویاں تھیں (واضح رہے کہ چار بیویوں کی پابندی شریعتِ محمدیؐ میں ہے' اس سے قبل ایسی کوئی پابندی نہیں تھی)۔ اس کے باوجود آپؑ کے دل میں ایک ایسی عورت سے نکاح کی رغبت پیدا ہوئی جو کسی دوسرے شخص کے نکاح میں تھی۔ بس اس خیال کا آنا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے آپؑ کو اس پر متنبہ فرمایا اور اس سے روکنے کی ایک صورت پیدا فرما دی۔

آیت ۲۱ ﴿وَهَلْ اَتٰىكَ نَبَؤُا الْخَصْمِ ۘ﴾ ''اور کیا آپ کے پاس خبر آئی ہے جھگڑنے والوں کی؟''

یہ ایک مقدمہ تھا جو دو مدعیداروں نے فیصلے کے لیے حضرت داؤد علیہ السلام کے سامنے پیش کیا۔

﴿اِذْ تَسَوَّرُوا الْمِحْرَابَ ﴿۲۱﴾﴾ ''جب وہ دیوار پھلانگ کر محراب میں داخل ہو گئے۔''

حضرت داؤد علیہ السلام تنہائی میں محو عبادت تھے کہ دو اشخاص اچانک آپؑ کے حجرے میں آدھمکے۔

آیت ۲۲ ﴿اِذْ دَخَلُوْا عَلٰى دَاوٗدَ فَفَزِعَ مِنْهُمْ﴾ ''جب وہ داؤدؑ کے پاس آئے تو وہ ان سے ڈرا۔''

تمام تر حفاظتی انتظامات کے باوجود دو افراد کا آپؑ کی خلوت گاہ میں اچانک در آنا ایک انتہائی غیر معمولی واقعہ تھا۔ چنانچہ آپؑ کو بجا طور پر تشویش ہوئی کہ نہ معلوم یہ لوگ کس نیت سے آئے ہیں۔

﴿قَالُوْا لَا تَخَفْ ۚ خَصْمٰنِ بَغٰى بَعْضُنَا عَلٰى بَعْضٍ﴾ ''انہوں نے کہا کہ آپ ڈریں نہیں' ہم دو مخالف فریق ہیں' ہم میں سے ایک نے دوسرے پر زیادتی کی ہے''

عربی میں ''خصم'' سے مراد وہ شخص ہے جو کسی کے بالمقابل ہو' یعنی دشمن یا مخالف فریق۔

﴿فَاحْكُمْ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ وَلَا تُشْطِطْ﴾ ''تو آپ ہمارے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کر دیجیے اور آپ اسے ٹالیے نہیں''

یعنی یہ مقدمہ ہمارے لیے بہت اہم ہے اور ہم اس کا فوری طور پر فیصلہ چاہتے ہیں۔ آپؑ اسے کسی اور وقت پر نہ ٹال دیجیے گا۔

﴿وَاهْدِنَآ اِلٰى سَوَآءِ الصِّرَاطِ ﴿۲۲﴾﴾ ''اور سیدھی راہ کی طرف ہماری

راہنمائی کیجیے۔''

ہمارے بیانات سن کر آپؑ ہمیں درست لائحہ عمل اختیار کرنے کی ہدایت فرمائیں۔

چنانچہ ان میں سے جو مدعی تھا اس نے اپنا مقدمہ اس طرح پیش کیا:

آیت ۲۳ ﴿اِنَّ هٰذَآ اَخِيْ لَهٗ تِسْعٌ وَّتِسْعُوْنَ نَعْجَةً وَّلِيَ نَعْجَةٌ وَّاحِدَةٌ ۭ﴾ ''یہ میرا بھائی ہے' اس کے پاس ننانوے دنبیاں ہیں اور میری ایک ہی دنبی ہے۔''

اگر ہم اس کی توجیہہ تورات کے مطابق کریں تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ مدعی نے کنائے کے انداز میں بات کی۔ وہ دراصل یہ کہنا چاہتا تھا کہ میری ایک ہی بیوی ہے جبکہ میرے مخالف کی ننانوے بیویاں ہیں۔

﴿فَقَالَ اَكْفِلْنِيْهَا وَعَزَّنِيْ فِي الْخِطَابِ ﴿۲۳﴾﴾ ''اب یہ کہتا ہے کہ وہ بھی میرے حوالے کر دو' اور گفتگو میں اس نے مجھے دبا لیا ہے۔''

آیت ۲۴ ﴿قَالَ لَقَدْ ظَلَمَكَ بِسُؤَالِ نَعْجَتِكَ اِلٰى نِعَاجِهٖ ۭ﴾ ''داؤدؑ نے کہا کہ یہ تو واقعتاً اس نے بہت ظلم کیا ہے' تمہاری دنبی کو اپنی دنبیوں کے ساتھ ملانے کا مطالبہ کر کے۔''

﴿وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْخُلَطَاۗءِ لَيَبْغِيْ بَعْضُهُمْ عَلٰي بَعْضٍ﴾ ''اور یقیناً مشترک معاملہ رکھنے والوں میں سے اکثر ایک دوسرے پر زیادتی کرتے ہیں''

قریبی رشتہ داروں کے باہمی اشتراک کو پنجابی میں ''شریکا'' کہا جاتا ہے اور شریکے والوں میں ایسا اکثر ہوتا ہے کہ جس کسی کو جہاں موقع ملتا ہے وہ دوسرے کے ساتھ زیادتی کرنے میں نہیں چوکتا۔

﴿اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَقَلِيْلٌ مَّا هُمْ ۭ﴾ ''سوائے ان لوگوں کے جو صاحبِ ایمان اور نیک عمل والے ہوں اور ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں۔''

﴿وَظَنَّ دَاوٗدُ اَنَّمَا فَتَنّٰهُ﴾ ''اور داؤدؑ کو اچانک خیال آیا کہ ہم نے اسے آزمایا ہے''

حضرت داؤد علیہ السلام سمجھ گئے کہ ان دو اشخاص کا ان کے پاس آنا اور آ کر مقدمہ پیش کرنا اللہ کی طرف سے تھا اور اللہ نے یہ ساری صورت حال انہیں متنبہ کرنے کے لیے پیدا فرمائی تھی۔

﴿فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهٗ وَخَرَّ رَاكِعًا وَّاَنَابَ ﴿۲۴﴾﴾ ''تو اُس نے (فوراً) اپنے رب سے استغفار کیا اور اُس کے حضور جھک گیا پوری طرح متوجہ ہو کر۔''

رکوع کے لغوی معنی جھکنے کے ہیں‘ لہٰذا یہاں رَاکِعًا سے رکوع بھی مراد ہوسکتا ہے اور سجدہ بھی۔

اس واقعہ کے حوالے سے جو اسرائیلی روایت دستیاب ہے اس کے متعلق حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ایک اثر (قول) بھی موجود ہے جس کے مرفوع ہونے کے بارے میں کوئی واضح اشارہ یا ثبوت موجود نہیں۔ ہوسکتا ہے انہوں نے حضور ﷺ سے اس بارے میں سنا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ انہوں نے اسرائیلی روایت سنی ہو اور اسی کو بیان کر دیا ہو (واللہ اعلم)۔ بہرحال میری رائے اس حوالے سے یہی ہے کہ انبیاء کے معاملے میں بشری تقاضوں کے عنصر کو نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے۔ سورۃ الاحزاب کی آیت ۵۲ ہم پڑھ چکے ہیں‘ جس میں حضور ﷺ سے فرمایا گیا ہے: ﴿لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنْۢ بَعْدُ وَلَآ اَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ اَزْوَاجٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ﴾ ’’اس کے بعد اب مزید عورتیں آپؐ کے لیے (نکاح میں لانا) جائز نہیں اور نہ یہ کہ آپ ان کی جگہ دوسری بیویاں بدل لیں اگرچہ ان کا حسن آپ کو کتنا ہی پسند ہو!‘‘ ان الفاظ میں حضور ﷺ کی خواہش کے امکان کا ذکر بہت واضح انداز میں ملتا ہے کہ اگر آپؐ کی طبیعت میں کسی خاتون سے نکاح کرنے کے بارے میں آمادگی پیدا ہو بھی جائے تو بھی آپؐ ایسا نہ کریں۔ چنانچہ اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ انبیاء انسان تھے اور اُن کی شخصیات میں انسانی و بشری تقاضے بھی موجود تھے‘ لیکن اس کے باوجود بھی وہ معصوم تھے۔ اس لیے کہ اگر کبھی کسی بشری تقاضے کے تحت کسی نبی کو کوئی ایسا خیال آتا بھی تھا جو کہ نہیں آنا چاہیے تھا تو اللہ تعالیٰ اس کی حفاظت فرماتا اور اس خیال کی تکمیل کی صورت پیدا نہیں ہونے دیتا تھا۔ اسی کا نام عصمتِ انبیاءؑ ہے۔

آیت ۲۵ ﴿فَغَفَرْنَا لَهٗ ذٰلِكَ ؕ وَاِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا لَزُلْفٰى وَحُسْنَ مَاٰبٍ ۝۲۵﴾ ’’تو ہم نے اُسے معاف کر دیا۔ اور یقیناً ہمارے پاس اس کے لیے مقامِ قرب اور اچھا انجام ہے۔‘‘

جب وہ ہمارے پاس لوٹ کر آئے گا تو ہم اسے بہت اعلیٰ مقام عطا کریں گے۔

آیت ۲۶ ﴿يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِى الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ﴾ ’’(ہم نے کہا:) اے داؤدؑ! ہم نے تمہیں زمین میں خلیفہ بنایا ہے‘ لہٰذا تم لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلے کرو‘‘

﴿وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ﴾ ’’اور دیکھو! اپنی خواہش کی

پیروی نہ کرنا کہ وہ تمہیں اللہ کی راہ سے بھٹکا دے گی۔‘‘

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌۢ بِمَا نَسُوْا يَوْمَ الْحِسَابِ ۝۲۶﴾ ’’یقیناً وہ لوگ جو بھٹک جاتے ہیں اللہ کے راستے سے اُن کے لیے بڑا سخت عذاب ہے‘ بسبب اس کے کہ وہ بھول گئے حساب کے دن کو۔‘‘

اگر حساب کا دن یاد رہے اور آخرت کی زندگی کا یقین دل میں موجود ہو تو انسان راہِ راست پر رہتا ہے۔

آیات ۲۷ تا ۲۹

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا ؕ ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنَ النَّارِ ۝ اَمْ نَجْعَلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِيْنَ فِى الْاَرْضِ ۙ اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِيْنَ كَالْفُجَّارِ ۝ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝

آیت ۲۷ ﴿وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا ؕ﴾ ’’اور ہم نے آسمان اور زمین کو اور جو کچھ ان دونوں کے مابین ہے‘ اسے بے کار پیدا نہیں کیا۔‘‘

یہ مضمون قرآن حکیم میں متعدد بار آیا ہے اور سورۂ آل عمران کی آیت ۱۹۱ میں تو اسی لفظ (باطل) کے ساتھ آیا ہے: ﴿رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝۱۹۱﴾ ’’اے ہمارے ربّ! تو نے یہ سب کچھ بے کار پیدا نہیں کیا‘ تُو پاک ہے‘ پس ہمیں آگ کے عذاب سے بچا لے!‘‘ سورۃ المؤمنون میں یوں فرمایا گیا ہے: ﴿اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ۝۱۱۵﴾ ’’کیا تم نے سمجھا تھا کہ ہم نے تمہیں بے کار پیدا کیا تھا اور یہ کہ تم ہماری طرف لوٹائے نہیں جاؤ گے!‘‘ مطلب یہ کہ عبث اور بے کار کام کرنا اللہ کی شان سے بہت بعید ہے۔

﴿ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنَ النَّارِ ۝۲۷﴾ ’’یہ گمان تو ان لوگوں کا ہے جنہوں نے کفر کیا‘ پس ہلاکت اور بربادی ہے ان کافروں کے لیے آگ کی۔‘‘

آیت ۲۸ ﴿اَمْ نَجْعَلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِيْنَ فِى

الْاَرْضِ﴾ ’’کیا ہم ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کیے‘ زمین میں فساد مچانے والوں کی طرح کر دیں گے؟‘‘

ظاہر ہے دنیا میں کچھ لوگ نیکوکار ہیں جو اکثر بھلائی کے کاموں میں کوشاں رہتے ہیں‘ جبکہ کچھ لوگ بدمعاش‘ ظالم اور شریر ہیں جو ہر وقت بدامنی پھیلانے اور لوٹ مار کرنے میں مصروف ہیں۔ اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر انسان کے لیے اسی دنیا کی زندگی ہی اصل زندگی ہوتی اور آخرت کی زندگی نہ ہوتی تو نیک لوگ اور مجرمین ایک جیسے ہو جاتے۔ یوں نہ تو نیکی کے راستے پر چلنے‘ غلط کاریوں سے بچنے اور قدم قدم پر مشکلات برداشت کرنے والوں کو کوئی جزا ملتی اور نہ ہی ان ظالموں‘ قاتلوں اور لٹیروں کو کوئی سزا ملتی جو خلقِ خدا پر ظلم بھی کرتے رہے اور عیش و عشرت کے مزے بھی لوٹتے رہے۔ بلکہ ایسی صورت میں نیکوں کار لوگ سخت گھاٹے میں رہتے کہ انہوں نے ساری زندگی تکلیفوں اور پابندیوں میں گزار دی اور اس کا کچھ اجر بھی انہیں نہ ملا۔ اس کے برعکس بدکردار اور بدقماش لوگ فائدے میں رہتے کہ انہوں نے عمر بھر جو چاہا کیا‘ نہ جائز و ناجائز کو دیکھا اور نہ ہی خود کو کبھی قانون اور اخلاقیات (scruples) کا پابند سمجھا اور پھر اس کی پاداش میں انہیں کوئی سزا بھی نہ ملی۔ اگر ایسا ہوتا تو اس کا سیدھا سادہ مطلب یہ ہوتا کہ یہ دنیا بے کار پیدا ہوئی ہے اور انسان کی جبلّت میں جو اخلاقی حس اور نیکی و بدی کی جو تمیز پیدا کی گئی ہے وہ بھی بے مقصد اور بے جواز ہے‘ کیونکہ اس تمیز اور حس کے مطابق تو نیکی کا نتیجہ اچھا اور برائی کا انجام برا ہونا چاہیے۔ اگر نظریاتی طور پر آخرت کی نفی ہو جائے تو یہ سب نتائج الٹے ہو جاتے ہیں۔

﴿اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِيْنَ كَالْفُجَّارِ ﴿٢٨﴾﴾ ’’کیا ہم متقیوں کو فاجروں کی طرح کر دیں گے؟‘‘

کیا ہم اپنے متقی بندوں کو ان فاسقوں اور فاجروں کے برابر کر دیں گے؟

آیت ۲۹ ﴿كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ﴾ ’’(اے نبی ﷺ!) یہ کتاب جو ہم نے آپ پر نازل کی ہے بہت بابرکت ہے‘‘

عربی میں اَلْبَرَکَۃ کسی چیز میں سے اُس کے خیر کو نکالنے والے عامل کو کہتے ہیں۔ اسے سمجھنے کے لیے ایک ایسے شخص کی مثال لیں جس کے اندر بِالقُوّۃ (potentially) کوئی مثبت صلاحیت یا اہلیت موجود ہے مگر چونکہ اس کی وہ صلاحیت غیر فعال (dormant) ہے

اس لیے نہ تو اسے اس کا شعور ہے اور نہ ہی وہ اس سے کوئی فائدہ اٹھا رہا ہے۔ چنانچہ اگر کوئی واقعہ یا کسی دوسرے شخص کا کوئی عمل یا کسی کی کوئی نصیحت اسے اس صلاحیت کا احساس دلا دے اور وہ اسے بروئے کار لانا شروع کر دے تو وہ واقعہ یا عمل گویا اس کے لیے برکت کا باعث بن گیا۔ اسی مفہوم میں بارش کے پانی کو قرآن میں مَآءً مُّبٰرَكًا (قٓ:۹) کہا گیا ہے۔ اس پانی کی برکت کا مشاہدہ ہم اپنی آنکھوں سے کرتے ہیں۔ زمین میں روئیدگی کی صلاحیت تو بالقوہ (potentially) موجود ہے مگر خشک اور بے آب و گیاہ زمین میں مختلف قسم کے بے شمار بیج خُفتہ (dormant) حالت میں بیکار پڑے رہتے ہیں۔ جب بارش کا پانی اس زمین کو سیراب کرتا ہے تو اس کے اندر جذب کا عمل (osmosis) شروع ہوتا ہے۔ اس عمل کی وجہ سے اس کے اندر موجود بیجوں کی قوتِ نمو کو انگیخت ملتی ہے‘ زمین کی خفتہ قوت یا صلاحیت بھی فعال ہو جاتی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے اس میں طرح طرح کے نباتات اُگنے لگتے ہیں۔ تو اس طرح گویا خشک زمین کے لیے بارش کا پانی مبارک یا باعث برکت ثابت ہوا۔

لفظ بَرَکَۃ سے متعلق اس وضاحت کی روشنی میں آیت زیر مطالعہ کا مفہوم یوں ہوگا کہ قرآن ایک ایسی کتاب ہے جو انسانی روح کی نشوونما کے لیے غذا فراہم کرتی ہے اور روح کے اندر موجود خیر اور نیکی کی غیر فعال (dormant) صلاحیت کو انگیخت دے کر اسے عمل صالح کے صدور کے قابل بناتی ہے۔ علامہ اقبالؔ نے انسان کو اس کی روح کی اہمیت کا احساس ان الفاظ میں دلایا ہے:

ہے ذوقِ تجلی بھی اسی خاک میں پنہاں
غافل تو نرا صاحبِ ادراک نہیں ہے

﴿لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿٢٩﴾﴾ ’’تاکہ وہ اس کی آیات پر تدبّر کریں اور ہوش مند لوگ اس سے سبق حاصل کریں۔‘‘ ۞۞۞

اپنے ذاتی اوقات میں سے کم از کم نصف گھنٹہ نکال کر
’’بیان القرآن‘‘ کے ترجمہ و ترجمانی کا ضرور مطالعہ کریں‘
آپ یقیناً مستفید ہوں گے۔ (ان شاء اللہ!)

ریاستِ مدینہ اور پاکستان

شجاع الدین شیخ☆

جب ہم 'ریاست مدینہ' کہتے ہیں تو یقیناً اس کی نسبت نبی اکرم ﷺ کی طرف جاتی ہے اور اس حوالے سے یہ جاننا ضروری ہے کہ آپ ﷺ کی تشریف آوری کا مقصد کیا تھا' آپ ﷺ کا پیغمبرانہ مشن کیا تھا؟ پھر ایک عظیم جِدّوجُہد کے نتیجے میں مدینہ میں جو اسلامی ریاست قائم ہوئی اور جس کی تمام وکمال برکتیں سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں نظر آتی ہیں' اس کے خدوخال کیا تھے؟ آج کل پاکستان کو مدینہ کے طرز کی ریاست بنانے کا جو عزم کیا جارہا ہے' یقیناً یہ مبارک ہے' لیکن سب سے پہلے ہم نے دیکھنا ہے کہ آج سے اکہتر (۷۱) برس قبل ہم نے جس پاکستان کو حاصل کیا تھا' اس کا مقصد کیا تھا؟ اگرچہ ہمارے آئین میں کچھ منافقتیں اور چور دروازے بھی موجود ہیں' مگر خوش قسمتی سے اس میں پاکستان کو ریاست مدینہ کے طرز کی ریاست بنانے کا بڑا مواد بھی موجود ہے۔

اسلام مکمل ضابطۂ حیات ہے!

سب سے پہلے ہم یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ کیا 'ریاست' دین کو مطلوب ہے؟ اگر آج ریاستوں کا تصور ہمارے سامنے ہو جہاں اجتماعی معاملات ایک نظم کے تحت چلتے ہوں' جہاں انتظامیہ' مقننہ' عدلیہ اور دیگر ادارے ہوں' تو کیا دین وہاں اپنا غلبہ چاہتا ہے؟ فقہاء کی اصطلاح میں 'قوتِ نافذہ' جسے آج کل حکومتی رٹ کہا جاتا ہے' کیا اس کی دین کو ضرورت ہے؟ تو اس کا سادہ سا جواب یہ ہے کہ ہاں دین کو اس کی ضرورت ہے۔ دین صرف چند عبادات کا نام نہیں اور نہ ہی یہ چند انفرادی باتوں کا مجموعہ ہے۔ انگریزی میں religion کی اصطلاح ''مذہب'' کے لیے استعمال ہوتی ہے' مگر اسلام کے لیے اس کا استعمال درست نہیں۔

☆ معاون برائے مرکزی شعبہ تعلیم وتربیت' تنظیم اسلامی

ہمارے بعض لوگ کہتے ہیں کہ مذہب انسان کا انفرادی معاملہ ہے۔ اس کے بارے میں جان لیجیے کہ یہ مغرب سے درآمد شدہ تصور ہے۔ ہندومت' جین مت' عیسائیت' یہودیت وغیرہ مذاہب ہیں' دین نہیں اور ان میں سے ہر ایک کے لیے مذہب (religion) کی اصطلاح درست ہے۔ انگریزی کی ہرڈکشنری میں آپ کو religion کی یہ تعریف ملے گی:

a set of instructions dealing the personal affairs of life

مذہب (religion) کی یہ تعریف بالکل درست ہے' لیکن اصل بات یہ ہے کہ یہ اصطلاح اسلام کے لیے درست نہیں' اس لیے کہ اسلام صرف ایک مذہب نہیں' بلکہ یہ مکمل دین ہے۔ اسلام انفرادی زندگی کے معاملات کے لیے بھی رہنمائی کرتا ہے' لیکن یہ صرف اس حد تک محدود نہیں' بلکہ یہ ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے اور یہ انفرادی اور اجتماعی دونوں سطحوں پر مکمل طور پر رہنمائی فراہم کرتا ہے۔

قرآن مجید کی بے شمار آیات اسلام کے بطورِ دین اور مکمل ضابطۂ حیات ہونے کو بیان کرتی ہیں' مثلاً سورۂ آل عمران میں فرمایا گیا: ﴿اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ﴾ (آیت ۱۹) ''اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے''۔ اور آگے آیت ۸۵ میں ارشاد ہوا: ﴿وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْہُ ۚ وَھُوَ فِی الْاٰخِرَۃِ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ﴾ ''اور جو اسلام کو چھوڑ کر کوئی اور دین اختیار کرے گا اسے اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا' اور ایسے لوگ آخرت میں خسارہ پانے والوں میں ہوں گے''۔ سورۃ المائدہ میں فرمایا گیا: ﴿اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا﴾ (آیت ۳) ''آج کے دن میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو مکمل فرما دیا ہے اور اپنی نعمت کا تم پر اتمام کر دیا ہے اور میں نے اسلام کو تمہارے لیے دین کے طور پر پسند کر لیا ہے''۔ پھر اللہ تعالیٰ سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۰۸ میں مطالبہ کرتا ہے: ﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً﴾ ''اے اہلِ ایمان! اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ''۔ اور اسی سورت کی آیت ۸۵ میں ارشاد ہوا: ﴿اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْکِتٰبِ وَتَکْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ یَّفْعَلُ ذٰلِکَ مِنْکُمْ اِلَّا خِزْیٌ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا ۚ وَیَوْمَ الْقِیٰمَۃِ یُرَدُّوْنَ اِلٰٓی اَشَدِّ الْعَذَابِ﴾ (آیت ۸۵) ''کیا تم کتاب کے بعض حصے کو مانتے ہو اور بعض کو نہیں مانتے؟ پھر تم میں سے جو کوئی یہ طرزِ عمل اختیار

کرے اس کی سزا اس کے سوا کیا ہے کہ دنیا میں ذلت و رسوائی ہو اور قیامت میں انہیں شدید عذاب کی طرف لوٹا دیا جائے۔‘‘

رسول اللہ ﷺ کا مشن اور آپؐ کی جدوجہد

آیئے‘ اب یہ دیکھیں کہ رسول اللہ ﷺ کا مشن کیا تھا۔ قرآن مجید کے تین مقامات (الصف:۹‘ الفتح:۲۸ اور التوبۃ:۳۳) پر آپ ﷺ کے مشن کا ذکر بایں طور فرمایا گیا: ﴿هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ﴾ ’’وہی ہے (اللہ) جس نے اپنے رسول مکرم (ﷺ) کو بھیجا الہدیٰ (مکمل ہدایت نامہ یعنی قرآن) اور دین حق (اسلام) دے کر تاکہ وہ اسے کُل نظام زندگی پر غالب کر دے‘‘۔ قرآن کریم صرف چھاپنے اور تلاوت کے لیے نہیں دیا گیا اور نہ صرف سیکھنے سکھانے کے لیے دیا گیا ہے‘ بلکہ اس لیے دیا گیا ہے کہ اس کا نفاذ ہو۔ سورۃ المائدۃ کی آیات میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے فتاویٰ نازل ہوئے ہیں: ﴿وَمَنْ لَّمْ یَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۴۴﴾.....فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۴۵﴾..... فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۴۷﴾﴾ ’’جو اللہ کے نازل کردہ احکام کے مطابق فیصلے نہیں کرتے وہی تو کفر کے مرتکب ہو رہے ہیں.....وہی تو ظلم کے مرتکب ہو رہے ہیں..... وہی تو نافرمانی کے مرتکب ہو رہے ہیں۔‘‘

قرآن حکیم نے صرف عبادات‘ عقائد اور رسومات ہی نہیں سکھائے‘ بلکہ اس نے معاشرے کے لیے زندگی گزارنے کے اصول بھی سکھائے‘ لوگوں کی جان و مال اور عزت و آبرو کے تحفظ کے لیے سزائیں بھی سکھائیں‘ معاشی عدم توازن سے بچانے کے لیے عدل کا ضابطہ بھی دیا — جس کے لیے سورۃ الحشر کی آیت ۷ میں یہ رہنمائی دی گئی: ﴿كَیْ لَا یَكُوْنَ دُوْلَةً م بَیْنَ الْاَغْنِیَآءِ مِنْكُمْ ۭ﴾ ’’کہ دولت تمہارے چند اُمراء تک محدود ہو کر نہ رہ جائے‘‘ — سود اور جوئے کی ممانعت کی اور ناپ تول میں کمی سے روکا۔ یہ سب احکام صرف انفرادی زندگی کے لیے نہیں‘ بلکہ اجتماعی زندگی کے لیے بھی ہیں اور قرآن مجید ان احکام کا نفاذ چاہتا ہے۔ حضور ﷺ کا مشن‘ جس کا اوپر ذکر آ چکا ہے‘ یہی تھا کہ جو نظامِ زندگی آپ ﷺ کو عطا کیا گیا ہے اسے دنیا کے تمام نظاموں پر غالب کریں۔ اس مشن کے لیے حضور ﷺ نے ۲۳ برس تک ایک طویل جدوجہد فرمائی۔ اس دوران طائف کی گلیوں میں آپ ﷺ کا مقدس ترین خون بہا‘ آنسوؤں

سے لبریز آنکھوں سے بیت اللہ شریف کو الوداع کہا۔ اُحد کے میدان میں ایک بار پھر آپ ﷺ کا مقدس ترین لہو بہا۔ اسی میدان میں آپ ﷺ نے ۷۰ شہید صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی لاشیں اٹھائیں۔ آپ ﷺ نے غزوۂ احزاب کے دوران پیٹ پر پتھر باندھے ہیں تاکہ صحابہ کرامؓ بھی دیکھ لیں کہ صرف ان کی کمریں بھوک سے دوہری نہیں ہو رہیں‘ ان کے نبی ﷺ نے بھی اپنے پیٹ پر پتھر باندھے ہوئے ہیں۔ ہم سورۃ الاحزاب میں اُسوۂ حسنہ کے بارے میں وارد شدہ آیت — ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (آیت ۲۱) ’’(اے مسلمانو!) تمہارے لیے اللہ کے رسولؐ میں ایک بہترین نمونہ ہے‘‘ — کی بہت باتیں کرتے ہیں‘ لیکن یہ بھی تو غور کریں کہ متعلقہ آیت غزوۂ احزاب کے دوران نازل ہوئی جس کے بارے میں قرآن نے فرمایا کہ اہل ایمان ہلا دیے گئے کہ تمام دشمنانِ اسلام متحد ہو کر اپنی پوری قوت کے ساتھ ان پر حملہ آور ہوئے تھے۔ پھر غلبۂ دین کی جدوجہد کے دوران ۲۵۹ شہید صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جانیں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے حضور پیش ہوئی ہیں۔ تب جا کر قرآن کہتا ہے: ﴿جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۭ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ﴿۸۱﴾﴾ (بنی اسرائیل) ’’حق آ گیا اور باطل مٹ گیا‘ یقیناً باطل ہے ہی مٹنے کے لیے‘‘۔ اور پھر سورۃ النصر میں لوگوں کے فوج در فوج اللہ کے دین میں داخل ہونے کا مژدہ سناتا ہے۔ یہ غلبہ رسول اللہ ﷺ کو بایں طور عطا ہوا کہ جہاں کفار و مشرکین کے احکام چلتے تھے‘ وہاں اللہ کے احکام کا نفاذ ہوا اور ریاست مدینہ قائم ہوئی۔

حضور ﷺ کی حیاتِ مبارکہ میں ایک طویل جدوجہد کے نتیجے میں اللہ کا دین غالب ہوا۔ غلبۂ دین کے بعد اڑھائی سال حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور میں اس کا دفاع ہوا اور جب اس کو استحکام ملا تو پھر اس کے نتیجے میں آدھی دنیا ہمارے قدموں تلے آ گئی اور سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں ۲۲ لاکھ مربع میل تک اس کی توسیع ہوئی اور اس کی برکات بتمام و کمال ظاہر ہوئیں۔

محمد ﷺ کی اوّلین حیثیت ’رسول اللہ‘ کی ہے!

ایک اور اصولی بات ہمیں سمجھ لینی چاہیے کہ ہم کبھی فاتحینِ عالم کی بات کرتے ہیں تو اس کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی عظمت بیان کرتے ہیں۔ اس ضمن میں یاد رکھیے کہ آپ ﷺ کی بنیادی حیثیت ’رسول اللہ‘ کی ہے‘ لہٰذا رسول اللہ ﷺ کی بنائی ہوئی ریاست مدینہ کی کوئی مثال دنیا میں آ ہی نہیں سکتی‘ البتہ وہاں سے اصول لے کر ہم کچھ کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں۔ پھر یہ کہ

حضور اکرم ﷺ کی ذات تو اعلیٰ ترین ہے‘ دنیا کو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ جیسی شخصیت بھی نہیں مل سکتی۔ بقول قائداعظم محمد علی جناح کہ ہم خلفائے راشدین سے رہنمائی لیں اور عہدِ حاضر کی اسلامی ریاست دنیا کے سامنے پیش کریں۔

جب کبھی ہم سیاستدانوں‘ فاتحین‘ قانون سازوں اور ججز وغیرہ پر بات کرتے ہیں یا طریقہ تدریس (teaching methodology) کی اصلاح وغیرہ کی بات کرتے ہیں تو اس حوالے سے حضور اکرم ﷺ کی بات بھی ضرور کریں۔ لیکن حضور اکرم ﷺ کی اولین حیثیت ’رسول اللہ‘ ہونے کو کبھی نہ بھولیں۔ سورۃ الحجرات میں بڑے واضح الفاظ میں فرمایا گیا: ﴿وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ فِيْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۭ﴾ (آیت ۷) ’’جان رکھو تمہارے درمیان اللہ کے رسول (ﷺ) ہیں‘‘۔ ڈاکٹر اسرار احمدؒ فرمایا کرتے تھے کہ آپ ﷺ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے شوہر بھی ہیں‘ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے چچازاد بھائی بھی ہیں اور سسر بھی ہیں‘ مگر آپ ﷺ کی پہلی حیثیت رسول اللہ کی ہے۔ جب تک بندۂ مومن اس کو پیش نظر نہیں رکھتا‘ شدید احتمال ہے کہ آپ ﷺ کی کسی اور شخصیت سے موازنے میں گستاخی کا مرتکب ہو جائے۔

میں نے آپ کے سامنے یہ بات اس لیے رکھی کہ ہم کبھی یہ حدیث بیان کرتے ہوئے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ’’میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا دونوں ایک ساتھ ہوں گے‘‘ ہم دونوں انگلیوں کو برابر کر کے دکھاتے ہیں۔ حضور ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے کوئی ادب سیکھے۔ ایک صحابیؓ رسول اپنے شاگردوں کو قربانی کے مسائل سکھا رہے تھے۔ انہوں نے اپنی انگلیوں پر گنتے ہوئے کہا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا‘ آپ ﷺ نے فرمایا کہ قربانی کے جانور میں اگر یہ اور یہ عیب ہوں تو اس کی قربانی درست نہیں۔ حدیث مکمل ہوگئی۔ اب ان صحابیؓ کی بات سنیں۔ کہنے لگے کہ یہ میرا ہاتھ اور میری انگلیاں ہیں اور ہم نے جو دیکھا تو وہ رسول اللہ ﷺ کا ہاتھ اور انگلیاں تھیں۔ ظاہر ہے دونوں میں کوئی موازنہ نہیں۔ لیکن کیا کریں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یقیناً تمہارے لیے رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں بہترین نمونہ موجود ہے۔ چنانچہ ہمیں رہنمائی وہیں سے ملے گی۔

ریاستِ مدینہ کے بنیادی خدوخال

وہ ریاستِ مدینہ جو رسالت مآب ﷺ نے قائم فرمائی‘ اس کے چند خدوخال آپ کے

سامنے پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔ اس سے پہلے یہ جان لیجیے کہ یہ ریاست امام الانبیاء ﷺ نے قائم فرمائی اور آپ ﷺ کا اُسوہ نماز اور باقی عبادات کے ضمن میں بھی ہے —— آپ ﷺ نے نماز کے لیے فرمایا: ((صَلُّوْا كَمَا رَاَيْتُمُوْنِيْ اُصَلِّيْ))(۱) ’’نماز اس طرح پڑھو جس طرح مجھے پڑھتے دیکھتے ہو‘‘۔ اسی طرح آپ ﷺ نے حج کے لیے فرمایا: ((خُذُوْا عَنِّيْ مَنَاسِكَكُمْ))(۲) ’’مجھ سے اپنے (حج کے) مناسک سیکھ لو‘‘ —— عبادات کی طرح ریاست کے لیے اُسوہ بھی ہمیں رسول اللہ ﷺ سے ہی ملتا ہے۔

ریاست مدینہ کی بنیاد: پہلی اصولی بات یہ ہے کہ ریاست مدینہ ایک نظریے کی بنیاد پر قائم ہوئی تھی جسے ہم نظریۂ ایمان یا نظریۂ توحید کہہ سکتے ہیں۔ اصل الاصول وہی ہے جو سورۃ الحجرات کی پہلی آیت میں بیان ہوا: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾ ’’اے اہلِ ایمان! اپنے معاملات کو اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) سے آگے نہ بڑھاؤ‘‘۔ اہلِ علم نے بڑا پیارا نکتہ بیان فرمایا کہ کوئی خاص معاملہ بیان ہوا ہی نہیں‘ ہمارے لیے کوئی چوائس ہی نہیں‘ بس ہم اس حکم کے پابند ہیں۔ اس کی مثال حدیث میں یہ بیان ہوئی کہ ’’مؤمن کی مثال اُس گھوڑے کی سی ہے جو اپنے کھونٹے سے بندھا ہوا ہو‘‘۔ ایک گھوڑے کو رسی سے باندھ دیا جائے تو وہ زیادہ سے زیادہ اس رسی کے دائرے کے بنے ہوئے احاطے کے اندر ہی چل پھر سکے گا‘ اسی طرح ایک مسلمان کے لیے اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے جو دائرہ معین کر دیا ہے وہ اس کے اندر رہنے کا پابند ہے‘ اس کے باہر وہ جا ہی نہیں سکتا۔ یہ ریاست مدینہ کا پہلا بنیادی اصول ہے۔ اس کی رہنمائی میں مسلمان کہیں بھی ریاست قائم کریں انہیں اس بنیادی اصول کی پیروی کرنی پڑے گی۔ اگر اس بنیاد پر کوئی ریاست قائم ہو تو وہ اسے دیگر تمام ریاستوں سے ممتاز کر دے گی۔

افراد پر محنت اور معاشرہ کی تشکیل: رسول اللہ ﷺ نے ریاست ایک دن میں قائم نہیں فرما دی۔ اس کی جدوجہد کے تمام مراحل سے آپ ﷺ کو گزرنا پڑا ہے۔ مکی دور کے ۱۳ برس کے دوران وہاں کے معاشرے میں لوہے کی نہیں قرآن کی تلوار چلی ہے۔ دعوت‘ افراد کی

(۱) صحیح البخاری‘ کتاب الاذان‘ باب الاذان للمسافر اذا کانوا جماعة والاقامة کذلك.....)

(۲) سنن النسائی‘ کتاب الحج۔

تربیت‘ جماعت کی تنظیم اور صبر کے کٹھن مراحل سے گزرنا‘ سب قرآن ہی کے ذریعے ہوا۔ قرآن حکیم میں چار مرتبہ مذکور ہے کہ رسول اللہ ﷺ قرآن کی تلاوت کرتے‘ لوگوں کا تزکیہ کرتے‘ احکام کی تعلیم دیتے اور حکمت کی باتیں سکھاتے ہیں۔ سورۃ الفرقان میں ارشاد ہوا:

﴿وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا ۝۵۲﴾ ’’(اے نبی ﷺ!) آپ ان سے بڑا جہاد کیجئے اس (قرآن) کے ذریعے سے‘‘۔ پھر افراد پر محنت ہوئی اور ۳۱۳/افراد تو الحمدللہ سن ۲ ہجری میں غزوۂ بدر کے موقع پر دکھائی دیتے ہیں۔ اکبرالٰہ آبادی کا بڑا پیارا شعر ہے ؎

خدا کے کام دیکھو بعد کیا ہے اور کیا پہلے!
نظر آتا ہے مجھ کو بدر سے غارِ حرا پہلے

اس دن کو اللہ ربّ العزت نے ’یوم الفرقان‘ قرار دیا ہے۔ ان کی تربیت قرآن کے ذریعے ہوئی تھی۔ یہ اللہ والے تھے جن کا مطمحِ نظر یہ تھا کہ بس اللہ راضی ہو جائے۔ کسی جنگ میں حضرت علی ؓ ایک کافر کے سینے پر سوار ہوئے اور جب اسے قتل کرنے لگے تو اُس نے انؓ پر تھوک دیا۔ حضرت علیؓ نے ہاتھ روک لیا اور نیچے اتر آئے۔ وہ شخص حیران ہوا جب اس نے حضرت علیؓ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں تجھے اللہ کے لیے قتل کرنا چاہ رہا تھا‘ اب جبکہ تو نے مجھ پر تھوک دیا تو امکان ہے کہ میرے انتقام کے جذبات کا اس میں دخل ہو جائے اور میرا یہ عمل اللہ کے لیے خالص نہ رہے‘ اس لیے میں نے تجھے چھوڑ دیا۔ اس کے بعد تو اسے ایمان ہی لانا تھا۔

ہجرت کے فوراً بعد صرف ایک معاشرہ وجود میں آیا اور ریاست اس انداز سے قائم نہیں ہوئی جیسے کہ ریاستیں آج قائم ہوا کرتی ہیں۔ اقتدار تو فتح مکہ کے بعد ملا ہے‘ جبکہ ہجرت کے بعد اختیار ملا ہے۔ تب مدینہ میں یہود کے قانون بھی چلتے تھے اور حضور ﷺ بھی حکم فرمایا کرتے تھے۔ آج جس کو ہم ریاست کہتے ہیں‘ اس کی شکل تو فتح مکہ کے بعد سامنے آئی‘ لیکن ہجرت کے بعد ایک معاشرہ قائم ہوا۔ اس معاشرے کی کیفیت کے حوالے سے صرف ایک ہی مثال کافی ہے کہ ایک گھر سے کھانا چلا اور بہت سے (ایک روایت میں ۱۷ کا ذکر ہے) گھروں سے ہوتا ہوا جس گھر سے چلا اسی گھر کو واپس آ گیا‘ اس لیے کہ ہر شخص سوچ رہا تھا کہ اس کا ہمسایہ زیادہ بھوکا ہے‘ لہٰذا وہ زیادہ حاجت مند ہے۔ گویا قرآن کی وہ تعبیر سامنے آتی ہے کہ ﴿وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ﴾ (الحشر:۹) ’’اور وہ اپنے آپ پر دوسروں کو ترجیح

دیتے ہیں خواہ وہ خود کتنے ہی ضرورت مند کیوں نہ ہوں۔‘‘

دوسری بات افراد پر محنت کی ہے کہ ان کے دلوں کو بدلنا ہے۔ فرد میں پائیدار تبدیلی قلب سے آتی ہے۔ بدلے ہوئے افراد ہی واقعتاً تبدیلی لے کر آ سکتے ہیں۔ کسی window dressing کے ذریعے اگر تیزی سے تبدیلی آ بھی جائے گی تو اتنی ہی تیزی سے چلی بھی جائے گی۔ چنانچہ ان افراد پر قرآن مجید کے ذریعے محنت کر کے انہیں اللہ والا بنایا گیا۔

ربّ العالمین کی طرف سے رحمۃ للعالمین کو دیا گیا منشور: تیسری بات رسول اللہ ﷺ ہجرت فرما رہے ہیں تو انہیں ایک منشور عطا کیا جا رہا ہے۔ کل آپ ﷺ کو اقتدار و اختیار ملے گا تو کیا کریں گے۔ سورۃ الحج میں آپ ﷺ کو ربّ العالمین کی طرف سے منشور عطا فرما دیا گیا:

﴿اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ۝۴۱﴾

’’وہ لوگ کہ جنہیں ہم زمین میں اقتدار عطا کریں گے تو وہ نماز قائم کریں گے‘ زکوٰۃ دیں گے‘ نیکی کا حکم کریں گے اور برائی سے روکیں گے۔ اور تمام امور کا انجام تو اللہ ہی کے قبضۂ قدرت میں ہے۔‘‘

اس منشور کا پہلا نکتہ یہ ہے کہ وہ نماز قائم کریں گے۔ گویا جو لوگ اقتدار میں ہوں‘ ان کی نماز کی ادائیگی فردِ واحد کی طرح نہیں ہوگی‘ بلکہ وہ نماز کی امامت کریں گے اور نظام ایسا بنائیں گے کہ لوگوں کو نماز کی ادائیگی میں سہولت ہو۔ اوقاتِ کار کے درمیان اگر نماز کا وقت آ جائے تو کام کو روکنا ہوگا۔

منشور کا اگلا نکتہ یہ کہ وہ زکوٰۃ دیں گے۔ اس میں فلاحی ریاست کا تصور بھی آ جاتا ہے۔ واضح رہے کہ زکوٰۃ کے ساتھ عُشر بھی جڑا ہوا ہے۔ خراج کی بات میں نہیں کر رہا کہ اس سے بحث طویل ہو جائے گی۔ آج ملک کی ۷۰ فیصد آمدنی زراعت پر مشتمل ہے جس کے ساتھ عُشر جڑا ہوا ہے۔ زکوٰۃ کی ادائیگی تو سال میں ایک مرتبہ ہوتی ہے‘ جبکہ فصل اگر سال میں دو بار اُگے تو عُشر بھی دو مرتبہ لاگو ہوتا ہے۔ لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ آج ہمارے ہاں کوئی عشر ادا نہیں کر رہا۔

امر بالمعروف ونہی عن المنکر: منشور کا تیسرا نکتہ یہ ہے کہ وہ نیکی کا حکم دیں گے اور برائی سے روکیں گے۔ ہم مسجد میں وعظ و نصیحت کر سکتے ہیں‘ ہمارے تبلیغی بھائی گھر گھر جا کر دین کی دعوت

پیش کر سکتے ہیں‘ لیکن ہم کسی کو حکم تو نہیں دے سکتے۔ یہ تو ریاست کا کام ہے کہ فرائض و واجبات پر عمل کرائے۔ ہم کیا سودی لین دین سے لوگوں کو باز رکھ سکتے ہیں؟ البتہ حکومت قانون سازی کے ذریعے برائیوں سے روک سکتی ہے۔

آیت کا آخری جملہ بہت قیمتی ہے کہ ’’سارے معاملات کا لوٹنا اللہ کی طرف ہے‘‘۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے لکھا کہ جسے بھی حکمرانی ملے وہ آیت کے اس حصے کو یاد رکھے۔ ایک فرد کو گھر کے افراد پر حکمرانی ملی ہے تو جس طرح اُسے اللہ کو جواب دینا ہے اسی طرح حکمرانوں کو اپنی رعیت کے حوالے سے جواب دہی کرنی ہے۔ اگر آج ہمارے دلوں میں کل کی جواب دہی کا احساس ہو تو حکمران بننا کیا آسان کام ہوگا؟

مسجد: ریاست مدینہ کا سکرٹیریٹ: رسول اللہ ﷺ نے ریاست مدینہ قائم فرمائی تو مسجد اس کا سکرٹیریٹ تھا۔ وہیں تمام ریاستی امور‘ مشورے‘ فیصلے‘ جنگی مہمات کی روانگی‘ سزاؤں کو نافذ کرنا وغیرہ سارے معاملات وہیں طے ہوتے تھے۔ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ اگر آج کوئی اسلامی ریاست قائم کرنی ہے تو معاملات کو مسجد سے جوڑنا ہوگا۔

قانون اور احتساب سے ماوراء کوئی نہیں: حضور ﷺ جو تعلیم لائے اور اس کے مطابق جو نظام قائم فرمایا اس میں تمام لوگوں کو قانونی مساوات حاصل تھی۔ ہمارا معاملہ تو یہ ہے کہ سلمان تاثیر نے گستاخِ رسول عورت کی حمایت کی تھی‘ لیکن اس کے خلاف پورے ملک میں کوئی ایف آئی آر درج نہیں کرائی جا سکی‘ اس لیے کہ گورنر ہونے کی وجہ سے اسے قانونی استثناء حاصل تھا۔ امام الانبیاء ﷺ کے دور کا ایک واقعہ سن لیں تو کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ مشہور واقعہ ہے کہ فاطمہ نامی عورت نے چوری کی۔ چونکہ بڑے گھرانے سے تعلق رکھتی تھی‘ لہٰذا اس کی سفارش آ گئی۔ رسول اللہ ﷺ کا چہرۂ مبارک غصے سے سرخ ہو گیا اور فرمایا کہ تم سے پچھلی قومیں اس لیے برباد ہوئیں کہ کوئی چھوٹا جرم کرتا تو اسے سزا دیتی تھیں اور کوئی بڑا جرم کرتا تو اسے چھوڑ دیا کرتی تھیں۔ اللہ کی قسم اگر فاطمہؓ بنت محمد ﷺ نے بھی چوری کی ہوتی تو میں اس کے بھی ہاتھ کاٹنے کا حکم دیتا۔

اسی طرح احتساب کے حوالے سے ہم میں سے کوئی بھی یہ کام کر سکے گا جو امام الانبیاء ﷺ نے مسجد کے منبر پر کھڑے ہو کر کیا؟ حیات طیبہ کے آخری ایام تھے۔ کئی وصیتیں

آپ ﷺ نے عطا فرمائیں۔ آپ ﷺ نے خود کو لوگوں کے سامنے پیش کیا اور فرمایا کہ اگر میں نے کسی کے ساتھ زیادتی کی ہو تو میں موجود ہوں‘ وہ مجھ سے حساب لے لے۔ ایک صحابیؓ نے اپنا معاملہ پیش کر دیا کہ ایک موقع پر آپؐ نے مجھے چھڑی ماری تھی جب کہ میرے جسم پر کُرتہ بھی نہیں تھا۔ آپ ﷺ نے قصاص کے لیے اپنا کُرتہ اٹھا دیا۔ مشہور واقعہ ہے کہ اسی بہانے انہوں نے مہر نبوت کو چوم لیا۔ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں گورنر مصر کے بیٹے کو کوڑے لگوائے گئے۔

احتساب کے حوالے سے سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے کام آسان کر دیا۔ جب کسی کو حکومتی اہلکار بنایا جاتا تو اس کے اثاثوں کا آج کی اصطلاح میں گوشوارہ بنا لیا جاتا۔ جب اس کو رخصت کیا جاتا تو اس وقت کے اس کے اثاثوں کا حساب لے لیا جاتا۔ اگر کوئی فرق نظر آتا تو اس کا احتساب کیا جاتا۔

معاشی مساوات اور اس کے لیے ناگزیر اقدامات: رسول اللہ ﷺ جو ریاست عطا فرما گئے اس کے معاشی نظام کے ذیل میں یہ ایک اصولی ہدایت ہے کہ دولت چند افراد کے ہاتھوں میں محدود ہو کر نہ رہ جائے۔ اسی کے لیے اسلام کے معاشی نظام میں زکوٰۃ‘ عُشر‘ صدقاتِ نافلہ‘ وراثت کے احکام‘ مالِ غنیمت کی تقسیم‘ مالِ فے‘ وصیت کے احکام اور بیت المال کا قیام وغیرہ شامل ہیں۔ اسی کے لیے سود‘ جوئے‘ سٹے اور حرام ذرائع سے حاصل ہونے والے مال پر پابندی لگائی گئی‘ کیونکہ ان کے نتیجے میں دولت چند افراد کے ہاتھوں میں سمٹ کر رہ جاتی ہے اور haves اور have nots کے طبقے وجود میں آ جاتے ہیں۔ لوگ جانوروں کی سطح پر زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ امیر امیر تر اور غریب غریب تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ کفالت عامہ کے لیے بیت المال کا قیام عمل میں لایا گیا‘ جس کا نتیجہ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں دکھائی دیتا ہے۔ ایک خاندان میں بچہ پیدا ہو جہاں اس کا باپ بیروزگار ہو تو بچے کے لیے وظیفہ بیت المال سے جاری کیا جاتا۔ شیر خوارگی کے دوران وظیفہ کم جبکہ بڑا ہونے پر وظیفہ بڑھا دیا جاتا۔ بیروزگاروں کے لیے وظیفے جاری کیے گئے۔ مشہور واقعہ ہے کہ جب آپؓ نے ایک بوڑھے یہودی کو بھیک مانگتے دیکھا تو اس سے وجہ پوچھی۔ جواب ملا کہ جب تک میں کما رہا تھا‘ ریاست کو جزیہ دے رہا تھا اور ریاست میری ضروریات پوری کر رہی

تھی‘ اب میں کمانے کے قابل نہیں۔ آپؐ نے بڑا تاریخی جملہ فرمایا کہ اب ہماری باری ہے‘ جب تک تو دے رہا تھا‘ ہم نے لیا اور اب تو گھر بیٹھ‘ اب تیری کفالت ریاست کی ذمہ داری ہے۔

آج ہم اسکنڈے نیوین ممالک اور ان کے سوشل ویلفیئر کی تعریفیں کرتے نہیں تھکتے‘ حالانکہ ان کے حکمرانوں سے پوچھا گیا تو انہوں نے یہی کہا کہ ہم عمرؓ کے قانون کی پیروی کر رہے ہیں۔ ہماری نگاہیں شرم سے جھک جانی چاہئیں کہ ہمیں اتنا بھی نہیں پتا کہ سیدنا عمر فاروقؓ ہمارے لیے کیا نمونہ چھوڑ گئے تھے۔ خلفائے راشدین کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’تم پر میری سنت اور میرے ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کی سنت پر عمل کرنا لازم ہے۔‘‘

تعلیمی نظام: اب آیئے تعلیم کے معاملے کی طرف۔ بیشک تعلیم بہت ضروری ہے‘ لیکن اس وقت ہمارا سارا زور عصری علوم پر ہے۔ ہم اس کی نفی نہیں کرتے۔ ہم تو کہتے ہیں کہ اسے چینالائز کریں اور پہلی وحی پر آ جائیں: ﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ①﴾ ’’پڑھو اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا‘‘۔ ہم نے اپنی تعلیم سے ربّ کے نام کو کیوں نکال دیا‘ اسے شامل کریں۔ ہمارے بچے ڈاکٹر‘ انجینئر‘ مجاہد‘ سپہ سالار یا پائلٹ بنیں‘ بہترین ٹیکنالوجی پر جائیں‘ مگر پہلے مسلمان تو بنیں۔ دنیا کے پچاس بڑے فراڈ نکلوا کر دیکھ لیں تو معلوم ہوگا کہ وہ سب پڑھے لکھے لوگوں نے کیے ہیں‘ جاہلوں نے نہیں کیے۔ وجہ ان کا کردار ہے اور اسی کو پوری دنیا رو رہی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے صفہ کا چبوترہ بھی بنایا۔ دین کے بارے میں قرآنی آیات اور احادیث ہمیں وہیں سے پہنچی ہیں۔ حضور ﷺ نے لوگوں کو عبرانی زبان سیکھنے کو بھی کہا اور ایک صحابیؓ نے یہ پندرہ دنوں میں سیکھی۔ حضرت عمر فاروقؓ کے دورِ خلافت میں تعلیم مفت‘ قرآن کا پڑھنا لازم‘ حتیٰ کہ بدو جو دیہاتوں میں رہتے تھے‘ ان کے لیے تعلیم لازم کر دی گئی۔ غزوۂ بدر کا واقعہ آپ کے ذہن میں ہوگا کہ قیدیوں پر رہائی کے لیے فدیہ کے طور پر یہ شرط رکھ دی گئی کہ ایک قیدی دس مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھائے۔ اب دیکھئے کیا قیدیوں نے قرآن وحدیث سکھایا؟ نہیں‘ بلکہ انہوں نے اس وقت کی معروف تعلیم سکھائی۔ گویا اصل اور بنیادی نکتہ یہ ہے کہ کوئی بھی تعلیم قرآن وسنت سے تجاوز کر کے نہ دی جائے۔

حدود وتعزیرات اور سزائیں: اسلام نے سزائیں عطا کی ہیں۔ قتل کے حوالے سے قصاص کا

قانون دیا گیا اور ورثاء کو حق دیا گیا کہ وہ چاہیں تو قاتل کو معاف بھی کر سکتے ہیں۔ اسی طرح چوری‘ زنا‘ زنا کی تہمت کی سزاؤں سمیت دیگر سزاؤں کا اہم ترین مقصد‘ جن کو مقاصد الشریعہ کہا جاتا ہے‘ یہ ہے کہ لوگوں کی جان ومال اور عزت وآبرو محفوظ رہے۔ اس کا ایک حصہ ماضی قریب تک سعودی عرب میں موجود تھا اور وہاں سزائیں علی الاعلان دی جاتی تھیں۔ امریکی صدر نکسن نے شاہ فیصل شہیدؒ سے پوچھا تھا کہ آپ کے ہاں اتنی سخت سزائیں کیوں دی جاتی ہیں؟ تو انہوں نے کہا تھا کہ اس کی برکات ہیں کہ یہاں جرائم نہ ہونے کے برابر ہیں۔ ہمارے ہاں ایک سال میں جتنے جرائم ہوتے ہیں اتنے آپ کی کسی ایک ریاست میں ایک دن میں ہو جاتے ہیں۔

معاشرت اور شرم وحیا: ہمارے پی ٹی آئی کے مہربانوں نے جو ریاست مدینہ کا عزم ظاہر کیا‘ وہ مبارک ہے۔ بیشک کرپشن ختم ہونی چاہیے‘ معاشی عدل ہونا چاہیے‘ لیکن یہ ریاست مدینہ کا ایک عنصر ہے۔ ریاست مدینہ کا معاشرتی نظام بھی تو تھا‘ جہاں سورۃ النور کی آیات نازل ہوئیں جن میں نگاہوں کی حفاظت کا حکم‘ ستر وحجاب کے احکامات دیے گئے ہیں۔ سورۃ الاحزاب کی آیات نازل ہوئیں جن میں جلباب کا حکم آیا اور مرد اور عورت کی مخلوط محافل کی نفی ہو گئی۔ جہاں رسول اللہ ﷺ نے خواتین کے لیے تعلیم کا علیحدہ نظام قائم کر رکھا تھا۔ شراب وفواحش اور رقص وسرود پر پابندی تھی۔ معاشرت کا یہ پہلو ریاست مدینہ کا ایک اہم عنصر ہے۔ اگر حیا چلی گئی تو سب گیا۔ جامع ترمذی کی روایت کے مطابق حیا اور ایمان ساتھی ہیں‘ اگر ایک چلا جائے تو دوسرا بھی چلا جائے گا۔

حقوقِ نسواں کی ایک جھلک: آج عورتوں کے حقوق کے حوالے بڑی باتیں کی جاتی ہیں‘ حالانکہ اسلام نے عورتوں کو کیسے کیسے حقوق عطا کیے ہیں‘ کاش ہماری خواتین کی بھی سمجھ میں آ جائے اور وہ کہیں کہ ہمیں وہ حقوق دے دو جو اسلام نے ہمیں عطا فرمائے ہیں۔ اسلام نے ماں کو کیا درجہ عطا کیا ہے۔ جنت ماں کے قدموں کے نیچے قرار دی گئی۔ کسی شخص کے حسن سلوک کی سب سے زیادہ مستحق ماں ہے۔ ماں تین درجے زیادہ حسن سلوک کی مستحق ہے اور باپ کا نمبر اس کے بعد آتا ہے۔ اللہ کی رضا باپ کی رضا میں اور اللہ کی ناراضگی باپ کی ناراضگی میں ہے۔ آج مغربی معاشرے میں لوگ بڑے خوش ہیں کہ انہوں نے اولڈ ہومز بنا دیے ہیں۔ کیا کسی ماں کے لیے اولڈ ہوم جنت ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ماں کو یا باپ کو محبت کی نظر

سے دیکھو تو حج کا ثواب ہے۔ دو چیزیں دیکھنے کو رسول اللہ ﷺ نے ثواب بتایا ہے‘ بیت اللہ اور والدین۔ اسلام میں ایک ماں کی کیا اُٹھان ہے؟ بیوی کی پرورش پر جنت کی بشارت ہے۔ تین بیٹیوں‘ تین بہنوں‘ تین پھوپھیوں یا تین خالاؤں کی کفالت پر جنت کی بشارت ہے۔ ایک مرحلہ بھی ایسا نہیں جہاں اسلامی تعلیمات کے مطابق عورت پر معاش یا کمائی کا جبر آتا ہو۔ بیٹی ہو تو باپ کی ذمہ داری‘ بہن ہو تو بھائی کی ذمہ داری‘ بیوی ہو تو شوہر کی ذمہ داری‘ شوہر کے انتقال کے بعد بیٹوں کی ذمہ داری‘ بیٹے نہیں تو باپ کی ذمہ داری‘ باپ نہیں تو بھائیوں کی ذمہ داری‘ بھائی نہ ہو تو چچا اور تایا کی ذمہ داری‘ وہ نہیں تو دادا کی ذمہ داری‘ وہ نہیں تو ماموں کی ذمہ داری‘ وہ نہیں تو نانا کی ذمہ داری‘ اور اگر کوئی نہیں تو اسلامی ریاست کی ذمہ داری‘ اور ریاست نہیں تو اُمت مسلمہ کی ذمہ داری‘ اس لیے کہ اسلامی ریاست کے قیام کی جدوجہد اُمتِ مسلمہ کا فرض ہے۔ اسلام عورتوں کو ملکہ بنا کر گھر میں بٹھاتا ہے۔ جبھی تو آج جو غیر مسلم اسلام قبول کر رہے ہیں‘ ان میں دو تہائی عورتیں ہیں۔

غیر مسلموں کے حقوق: غیر مسلموں کے حقوق کے حوالے سے ماقبل سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور کا واقعہ بیان ہو چکا ہے۔ ’ذمی‘ اس غیر مسلم شہری کو کہا جاتا ہے جو اسلامی ریاست کی بالادستی قبول کر لے اور جزیہ دے۔ جزیہ کوئی گالی نہیں بلکہ ایک ٹیکس ہے جو اس کی جان‘ مال‘ آبرو‘ عقیدہ‘ عبادت گاہ کی حفاظت کے لیے ہے‘ کیونکہ ان سب کی حفاظت کی ذمہ داری اسلامی ریاست پر ہے۔ ذمی کے ساتھ زیادتی کرنے والے اور اس کا حق مارنے والے کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ وہ جنت کی خوشبو بھی نہیں سونگھ سکے گا۔

بروقت انصاف‘ بروقت سزا: لوگوں کے معاملات میں اگر نزاع پیدا ہو جائے تو ان کی عدالت تک رسائی ہو اور وہ اپنے فیصلے وہاں سے بلا معاوضہ حاصل کر سکیں‘ یہ ریاست کی ذمہ داری ہے۔ ہم نے جیلوں کا اتنا بڑا انظام قائم کر رکھا ہے جہاں مجرم پلتے ہیں۔ اسلام کا قانون یہ ہے کہ جرم ثابت ہو جائے تو سزا دو‘ ورنہ اسے بَری کر کے گھر بھیجو۔ یہ جو ہم پچیس پچیس سال مجرموں کو پال رہے ہوتے ہیں جن پر قوم کا پیسہ برباد ہو رہا ہے‘ اس کا اسلام میں کوئی تصور نہیں۔

آزادیٔ اظہارِ رائے: اظہار رائے کے حوالے سے ایک واقعہ ہی کافی ہے۔ ایک بوڑھی اماں نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے پوچھ لیا کہ عمر! تمہیں کس نے اختیار دیا ہے کہ تم عورتوں

کے مہر کی زیادہ سے زیادہ حد مقرر کرو‘ جبکہ قرآن مہر کے بارے میں ڈھیروں (قِنطار) کا لفظ استعمال کرتا ہے کہ اگر کوئی دے دے تو واپس نہ لے۔ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے‘ جن کے نام سے اس وقت دنیا کانپتی تھی‘ فرمایا کہ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے ایک بوڑھی اماں کے ذریعے عمر کو دین سکھا دیا۔

وہ واقعہ بھی ہمیں یاد ہے جب حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے برسرِ منبر پوچھا تھا کہ اے عمرؓ! آپ کو اتنا کپڑا کہاں سے مل گیا جس سے آپ جیسے طویل القامت شخص کا کُرتہ بن سکے؟ اور انہوں نے کہا کہ ہم نہ آپ کی سنیں گے اور نہ مانیں گے! سوال یہ کیا گیا کہ جو کپڑا سب کو مالِ غنیمت سے ملا تھا‘ اس سے آپ جیسے طویل القامت شخص کا کُرتہ نہیں بن سکتا تھا۔ اس پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے یہ نہیں کہا کہ اسے اٹھا کر غائب کر دو‘ کہیں ٹارچ سیل میں ڈال دو‘ بلکہ بیٹے سے کہا کہ عبداللہ! تم اس کا جواب دو۔ بیٹے نے کہا کہ میں نے اپنے حصے کا کپڑا ابا جان کو دے دیا تھا‘ تب ان کا کُرتہ بنا۔ تب حضرت سلمان فارسیؓ نے کہا کہ اب ہم سنیں گے بھی اور مانیں گے بھی! ان دو واقعات سے ایک اسلامی ریاست میں اظہارِ رائے کی آزادی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

نظامِ عبادات: اب آتے ہیں ریاستِ مدینہ میں نظامِ عبادات کی طرف۔ مسجد نبویؐ میں امام‘ امام الانبیاء ﷺ تھے۔ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم بھی اپنے اپنے دور میں مسجد کے امام تھے۔ یہ بہت بھاری ذمہ داری ہے‘ اگر آج کے حکمران اور ان کے مقامی ذمہ داران اسے نبھا سکیں۔

احساسِ ذمہ داری اور فکرِ آخرت: احساسِ ذمہ داری اور فکرِ آخرت کے حوالے سے حضور اکرم ﷺ کا واقعہ اوپر گزر چکا جس میں آپ ﷺ نے خود کو بدلے کے لیے پیش فرمایا تھا کہ اگر کسی کے ساتھ زیادتی ہوئی ہو تو وہ بدلہ لے لے۔ سیدنا عمر فاروقؓ کی احساسِ ذمہ داری کے لیے بس ایک واقعہ کافی ہے۔ آپؓ اپنے دورِ خلافت میں راتوں کو گشت کیا کرتے تھے۔ ایک دن ایک گھر سے بچوں کے رونے کی آواز آئی۔ اناج بیت المال کے گودام سے خود اٹھا کر لائے۔ خادم نے کہا کہ میں اٹھا لیتا ہوں۔ فرمایا کہ کیا تو قیامت کے دن میرا بوجھ اٹھائے گا؟ بچوں کی ماں سے کہا کہ بچوں کو بہلاؤ‘ میں کھانا تیار کرتا ہوں۔ اس نے کہا کہ آپ جائیں میں کھانا تیار کر لوں گی۔ فرمایا: نہیں‘ میں نے جن بچوں کو روتے ہوئے دیکھا اب میں ان کو ہنستے

ہوئے دیکھنا چاہتا ہوں۔ چولھا جل رہا تھا اور وہ اپنے آپ سے کہہ رہے تھے کہ اے عمر! تجھے اس آگ سے کیسے بچنا ہے؟ اپنی ذمہ داری کا خیال کر!

اسی طرح سیدنا علی مرتضیٰ ؓ کوفے میں تھے۔ بیت المال سے سامان نکل جاتا یعنی مستحقین تک پہنچ جاتا تو اللہ کا شکر ادا کرتے۔ زمین سے خطاب کرتے کہ تو گواہ رہ‘ میرے رب نے میرے کاندھوں پر جو ذمہ داری ڈالی میں نے اسے ادا کر دیا!

پاکستان اور ریاستِ مدینہ

میں نے ریاست مدینہ کے چند خدوخال آپ کے سامنے رکھے ہیں۔ اب ہم پاکستان کی طرف آتے ہیں۔ اکہتر سال قبل ہم نے اس ملک کو اسلام کے نام پر حاصل کیا۔ اس ملک کا خواب دینے والے علامہ اقبال اور معمار قائداعظم محمد علی جناح تھے۔ وہ اس بارے میں بالکل واضح تھے۔ الزام تراشی تو لوگوں نے علامہ اقبال پر بھی کی۔ لوگوں نے تو انبیاء کرام ؑ کو نہیں چھوڑا تو دوسروں کی کیا حیثیت ہے۔ علامہ اقبال نے قائداعظم کو خطوط لکھ کر بلایا۔ کہا کہ جہاں تک میں نے غور کیا‘ ہمارے مسائل کا حل سوائے اسلام کے کہیں نظر نہیں آیا۔ ہمارا دین اپنا نفاذ چاہتا ہے اور اس کے لیے ہمیں ایک آزاد خطۂ زمین چاہیے۔ اگر ایسا ہو گیا تو اسلام کے چہرے پر دورِ ملوکیت میں جو پردے پڑ گئے تھے‘ ہمیں ان کو ہٹا کر اسلام کا اصل چہرہ دنیا کے سامنے لانے کا موقع مل جائے گا۔ قائداعظم سے پوچھا گیا کہ آپ کا آئین کیا ہوگا؟ فرمایا کہ ہمارا آئین تو چودہ سو برس قبل نازل ہو چکا ہے۔ اس طرح کے بیشتر اقوال موجود ہیں۔

قائد کی ایک تقریر کے ایک جملہ کو آج کل بہت زیر بحث لایا جاتا ہے جس سے لوگ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ پاکستان اسلام نہیں‘ سیکولرزم کے لیے بنا تھا‘ حالانکہ ان کی سینکڑوں دیگر تقاریر اسلام کے حوالے سے موجود ہیں۔ اپنی ایک تقریر میں فرمایا کہ ’’میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ لوگ کیوں اس طرح کا تاثر دینا چاہتے ہیں کہ پاکستان میں شریعت اسلامی نافذ نہیں ہوگی۔ میرے لیے آج بھی اسلامی اصول اسی طرح مؤثر ہیں جس طرح آج سے چودہ صدی قبل تھے‘‘۔ یہ ان کا ۱۹ جنوری ۱۹۴۸ء کا خطاب ہے۔ ڈاکٹر ریاض علی شاہ ان کے ذاتی معالج تھے۔ انہوں نے قائداعظم کی حیات کے آخری ایام میں بستر مرگ پر کہی گئی بات کو نقل کیا جو ان کی ڈائری سے روزنامہ جنگ (۱۱ ستمبر ۱۹۸۸ء) میں شائع ہوئی۔ انہوں نے کہا

کہ وفات سے قبل قائداعظم کی جو باتیں ہمارے کانوں میں پہنچیں ان میں یہ بات بھی تھی کہ:

> ’’تم جانتے ہو جب مجھے یہ احساس ہوتا ہے کہ پاکستان بن چکا ہے تو میری روح کو کس قدر اطمینان ہوتا ہے۔ یہ مشکل کام تھا اور میں اکیلا اسے کبھی نہ کر سکتا تھا۔ میرا ایمان ہے کہ یہ رسولِ خدا ﷺ کا روحانی فیضان ہے کہ پاکستان وجود میں آیا۔ اب یہ پاکستانیوں کا فرض ہے کہ وہ اسے خلافت راشدہ کا نمونہ بنائیں‘ تاکہ خدا اپنا وعدہ پورا کرے اور مسلمانوں کو زمین کی بادشاہت دے.....‘‘

ہم کراچی میں رہنے والے اپنے آپ کو مہاجر کہتے ہیں۔ ہم نے ہجرت کیوں کی تھی؟ آج ہماری چوتھی نسل آ چکی ہے‘ آج کے بچے بھی اسکول میں یہی پڑھتے ہیں کہ ’’پاکستان کا مطلب کیا: لا الٰہ الا اللہ‘‘۔ الحمدللہ ۱۹۴۹ء میں دستور ساز اسمبلی میں قرارداد مقاصد منظور کر لی گئی جو ہمارے دستور کا حصہ ہے۔ وہ بعینہٖ وہی بات ہے جو سورۃ الحجرات کی پہلی آیت کا حاصل ہے کہ اپنے معاملات کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے آگے نہ بڑھاؤ۔ ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے بقول ہم نے ایک حد تک پاکستان کو اسلام کا کلمہ پڑھایا ہوا ہے۔ ہم نے اس میں لکھا ہے کہ حاکمیت اعلیٰ صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے اور ہم حاکم نہیں ہیں۔ عوام کی حاکمیت ایک کفریہ نعرہ ہے۔ قرآن حکیم بار بار کہتا ہے کہ حاکمیت صرف اللہ کے لیے ہے ﴿اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ﴾ —— ہمارے دستور میں واضح طور پر درج ہے کہ کوئی قانون سازی اس ملک میں قرآن وسنت کے خلاف نہیں ہوگی۔ ہمارے ملک کا نام اسلامی جمہوریہ پاکستان ہے۔ ایک صاحب اسلام آباد اکیڈمی میں غیر ملکی معاملات کو دیکھتے ہیں۔ مجھے وہ بڑے مجاہد قسم کے آدمی لگے۔ انہوں نے کہا کہ یہ پاکستان اور جمہوریہ بعد میں ہے‘ اسلامی پہلے ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمدؒ فرماتے تھے کہ پاکستان کو کلمہ توحید تو پڑھایا ہوا ہے‘ لیکن یہاں کچھ نہ کچھ منافقت بھی ہے۔ جسٹس نسیم حسن شاہ نے کسی فیصلے میں کہہ دیا تھا کہ آئین میں بہت ساری شقیں ہیں‘ ان میں سے یہ بھی ایک شق ہے۔ ہمارا دینی تقاضا یہ ہے کہ اس شق کی پورے آئین پر بالادستی ہونی چاہیے‘ جب کہ اس شق کو باقی شقوں کے برابر کر دیا گیا ہے۔

اسی آئین میں درج ہے کہ یہاں کی حکومت کی ذمہ داری ہے کہ یہاں کے رہنے والوں کو قرآن وسنت کے احکامات کو سیکھنے اور ان پر عمل کرنے کے مواقع فراہم کرے۔ سود اللہ اور رسول ﷺ سے جنگ ہے۔ آئین میں لکھا ہے کہ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ جلد از جلد سود کی ہر

قسم کو پاکستان سے ختم کرے۔ یہ تو دین کا بھی تقاضا ہے اور آئین کا بھی۔ پھر ہمارے حکمرانوں کے لیے مشکل کیا ہے؟

ایک اور مسئلہ اٹھایا گیا کہ پاکستان میں کس کا اسلام آئے گا؟ دیوبندیوں‘ بریلویوں‘ اہلِ حدیث یا اہلِ تشیع کا؟ ۱۹۵۳ء میں اس ملک کے ۳۱ چوٹی کے علماء نے ۲۲ متفقہ نکات اس کے جواب میں پیش کر دیے۔ ان حضرات کی فراست کو داد دیے بغیر نہیں رہا جاسکتا کہ ہمارے آئین میں درج عبارتوں سے بہتر عبارات ان ۲۲ نکات میں موجود ہیں۔ ان میں سے چند نکات ملاحظہ فرمائیں۔ اس آئین کی بنیاد کیا ہونی چاہیے‘ اس پر تین نکات موجود ہیں۔ تعلیم و تربیت کے لیے دو نکات ہیں۔ شہری حقوق کے بارے میں چار نکات اور غیر مسلموں کے حقوق کے بارے میں دو نکات موجود ہیں۔ ریاست کے سربراہ کی تقرری اور معزولی کیسے ہو‘ اس کے حقوق و فرائض کیا ہوں اس بارے میں چھ نکات ہیں۔ آزاد عدلیہ کے بارے میں دو نکات ہیں۔ مذہب‘ فرقوں اور دیگر تعصّبات کے نام پر پیدا ہونے والے انتشار کے سدِّ باب کے لیے تین نکات ہیں۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ آئین میں قرارداد مقاصد کی شق کو بالادست رکھا جائے۔ جو شق آئین میں اس کے خلاف ہے‘ اسے ختم کیا جائے۔ صرف وفاقی سطح پر ہی نہیں بلکہ صوبے اور اضلاع سمیت ہر جگہ یہ طے ہو کہ کوئی قانون سازی قرآن و سنت کے خلاف نہیں ہوگی۔ اس طرح ہم آئین کو واقعتاً مسلمان کرلیں گے۔

آخر میں دعا ہے کہ پاکستان صحیح معنوں میں ریاست مدینہ کے ماقبل بیان کردہ خدوخال کے مطابق ریاست بن جائے اور اللہ تعالیٰ ہمارے موجودہ حکمرانوں کو توفیق دے کہ وہ سود کا نظام ختم کردیں۔ اب اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے جنگ ختم ہو جانی چاہیے‘ اس لیے کہ قوم اس کی متحمل نہیں ہوسکتی۔

❁ ❁ ❁

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبویؐ آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور دعوت و تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ

انجینئر محمد رشید عمر

نبی کریم ﷺ کی زبان مبارک سے ایمان باللہ اور ایمان بالآخرۃ کی دعوت' اعلیٰ اخلاقی اقدار کے حامل معاشرے کی تشکیل کی دعوت اور عدل وقسط پر مبنی نظام کی وضاحت اور اس کے قیام کی جدوجہد اس قدر مؤثر اور منطقی تھی کہ اس نے معاشرے کے اندر ایک ہلچل مچا دی اور سلیم الفطرت لوگ اس کی طرف کھنچے چلے آئے۔ لیکن جن طبقات کے مفادات پر زد پڑ رہی تھی' جن کی قیادت وسیادت کو خطرات لاحق ہو رہے تھے' انہوں نے پورے زور سے اس تحریک کا راستہ روکنے کی کوشش کی۔ ان لوگوں کی مزاحمت کا زور توڑنے کے لیے دنیوی معیارات کے مطابق جن وسائل وذرائع کی طرف آپ ﷺ کی نظر اُٹھ سکتی تھی وہ یہ تھے:

(۱) عوام کی اکثریت۔

(۲) معاشرے کے نمایاں لوگ جو کھلے وسائل کے مالک تھے اور مؤثر حیثیت رکھتے تھے۔

جہاں تک عوام الناس کی تائید کا تعلق ہے یہ ایسا عامل (factor) ہے کہ آج کی سیاست اور قیادت سازی میں یہ فیصلہ کن رول رکھتا ہے۔ جو آدمی عوام کے جذبات کی ترجمانی کی جتنی قابلیت رکھتا ہے اتنا بڑا لیڈر بن سکتا ہے۔ لیکن نبوت کا مسئلہ عوام کی ترجمانی نہیں بلکہ حق کی ترجمانی ہوتا ہے' وہ خود حق کے تابع ہوتا ہے اور انسانیت کو بھی حق کے تابع کرنا اس کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ اس کی طاقت اس کی وہ سیرت اور کردار ہوتا ہے جس سے وہ خود حق کی پیروی کر رہا ہوتا ہے' جس سے وہ لوگوں کے دلوں کو مسخر کرتا ہے۔ چنانچہ اسے اکثریت کا ترجمان بن کر ان کو پیچھے لگا کر مخالفین کا مقابلہ کرنے سے روک دیا جاتا ہے:

﴿وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ﴾ (الانعام:۱۱۶)

''اور اگر تم پیروی کرو گے زمین میں بسنے والوں کی اکثریت کی تو وہ تمہیں اللہ کے راستے سے لازماً گمراہ کر دیں گے۔''

تفسیر: مشاہدہ اور تاریخ بتلاتے ہیں کہ دنیا میں ہمیشہ فہیم' محقق اور بااصول آدمی تھوڑے

رہے ہیں۔ اکثریت ان ہی لوگوں کی ہوتی ہے جو محض خیالی' بے اصول اور اٹکل پچو باتوں کی پیروی کرنے والے ہوتے ہیں۔ اگر تم اسی اکثریت کا کہنا ماننے لگو اور بے اصول باتوں پر چلنا شروع کر دو گے تو خدا کی بتلائی ہوئی سیدھی راہ سے بہک جاؤ گے۔ یہ آپ ﷺ کی وساطت سے دوسروں کو خبردار کیا گیا۔ (ماخوذ از تفسیر عثمانی)

آج یہ فتنہ جمہوریت کی شکل میں ہمیں لپیٹ میں لے چکا ہے۔ دین کے نفاذ کے مسئلہ کو جمہوری رائے کے تابع کر دیا گیا ہے اور اس کے نفاذ کے لیے چلنے والی کچھ تحریکیں بھی کسی نہ کسی شکل میں اس فتنے کا شکار ہو چکی ہیں۔

دوسرے لوگ جن کی طرف داعی حق کی نظر اٹھتی ہے' وہ صاحب حیثیت' دنیاوی وسائل کے مالک اور معاشرے پر اثر رکھنے والے لوگ ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ اگر یہ لوگ اس تحریک کا ساتھ دیں گے تو پھر دین کے نفاذ کی تحریک کو تقویت حاصل ہوگی۔ یہی وہ لوگ ہوتے ہیں جو تحریک کی مخالفت کی صورت میں:

(۱) اس شرط پر ساتھ دینے کے لیے تیار ہوتے ہیں کہ اپنی بات بھی منوالیں گے۔

(۲) احسانات کر کے اخلاقی دباؤ ڈال کر اس کا رخ اپنی مرضی سے موڑ لیں گے۔

(۳) اپنی اصلاحی اور فلاحی خدمات سے اہلِ ایمان کے کندھوں پر سوار ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔

قرآن مجید میں ایسی کوششوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ چند مقامات کا حوالہ پیش کیا جاتا ہے:

(ا) ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ لِيَصُدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ﴾ (الانفال:۳۶)

''بے شک جو لوگ کافر ہیں وہ خرچ کرتے ہیں اپنے مال تاکہ روکیں اللہ کی راہ سے۔''

(ب) ﴿وَاِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا غَيْرَهٗ ۡ وَاِذًا لَّاتَّخَذُوْكَ خَلِيْلًا﴾ (بنی اسراءیل)

''اور (اے نبی ﷺ!) یہ لوگ تو اس بات پر تلے ہوئے تھے کہ آپ کو فتنے میں ڈال کر اُس چیز سے ہٹا دیں جو ہم نے آپ کی طرف وحی کی ہے' تاکہ آپ اس کے علاوہ کوئی اور چیز گھڑ کر ہم سے منسوب کر دیں' اور (اگر آپ ایسا کرتے) تب تو یہ لوگ آپ کو اپنا گاڑھا دوست بنا لیتے۔''

(ج) ﴿اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَاۗجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَجٰهَدَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ

الظّٰلِمِیْنَ ﴿۱۹﴾ (التوبۃ)

''کیا تم نے کر دیا حاجیوں کو پانی پلانا اور مسجد حرام کا بسانا برابر اس کے جو یقین لایا اللہ پر اور آخرت کے دن پر اور لڑا اللہ کی راہ میں؟ یہ برابر نہیں ہیں اللہ کے نزدیک۔ اور اللہ ایسے ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔''

(۹) ﴿وَوَصَّیْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَیْهِ حُسْنًا ؕ وَاِنْ جَاهَدٰكَ لِتُشْرِكَ بِیْ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا ؕ اِلَیَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۸﴾﴾ (العنکبوت)

''اور ہم نے تاکید کر دی انسان کو اپنے ماں باپ سے بھلائی سے رہنے کی' اور اگر وہ تجھ کو مجبور کریں کہ تو شریک کرے میرا جس کی تجھ کو خبر نہیں تو ان کا کہنا مت مان! میری ہی طرف تمہارا لوٹنا ہے' پس میں تمہیں خبردار کر دوں گا جو تم کرتے تھے۔''

ایسے لوگوں کی چالوں سے بچنے کے لیے نبی اکرم ﷺ کو ہدایت دی گئی:

﴿وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِیِّ یُرِیْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَیْنٰكَ عَنْهُمْ ۚ تُرِیْدُ زِیْنَةَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ۚ وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا ﴿۲۸﴾ وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۟ فَمَنْ شَآءَ فَلْیُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْیَكْفُرْ ۚ﴾ (الکہف)

''اور اپنے آپ کو روکے رکھئے ان لوگوں کے ساتھ جو اپنے رب کو پکارتے ہیں صبح و شام' وہ اللہ کی رضا کے طالب ہیں' اور آپؐ کی نگاہیں ان سے ہٹنے نہ پائیں' (جس سے لوگوں کو یہ گمان ہونے لگے کہ) آپؐ دنیاوی زندگی کی آرائش و زیبائش چاہتے ہیں۔ اور مت کہنا مانئے ایسے شخص کا جس کا دل ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے اور جو اپنی خواہشات کے پیچھے پڑا ہے اور اس کا معاملہ حد سے متجاوز ہو چکا ہے۔ اور آپؐ کہہ دیجیے کہ یہی حق ہے تمہارے رب کی طرف سے' تو اب جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر کرے۔''

اور آپ ﷺ کے ساتھیوں کو یہ حکم دیا گیا:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا ۟ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۲۰۰﴾﴾ (آل عمران)

''اے اہلِ ایمان! صبر کرو اور صبر میں اپنے دشمنوں سے بڑھ جاؤ اور مربوط رہو' اور اللہ کا تقویٰ اختیار کیے رکھو تاکہ تم فلاح پاؤ۔''

آج کی دینی قیادتیں جنہوں نے اقامت دین کی فکر اور کوششوں میں جان ڈالی ہے وہ ان فتنوں کا مقابلہ کرتی رہی ہیں' لیکن یہ قیادتیں جب دنیا سے رخصت ہو جاتی ہیں تو بعد میں آنے والوں کے لیے یہ معاملات آزمائش بن جاتے ہیں۔ خاص طور پر وہ کارکن جنہوں نے اپنے قائد اول کے ساتھ تحریک کو اٹھانے کے لیے خون کے دیے جلانے میں ان کی مدد کی ہوتی ہے اور اس بڑے قائد کی موجودگی میں انہیں اپنی بعض صلاحیتوں کے اظہار کا موقع نہیں ملتا' وہ کارکن جب اپنی پوری شخصیت کے ساتھ میدان میں آتے ہیں تو وہ اپنے رنگ کے ساتھ ذیلی اور مقامی قیادتوں کا روپ دھار لیتے ہیں۔ ایک بڑی قیادت کی رفاقت اور جماعت کا نام انہیں اور نمایاں کر دیتا ہے۔ پھر دو طرح کے نتائج سامنے آتے ہیں۔ ایک نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان مقامی قیادتوں کی وجہ سے جماعت کے اندر گروہ اور دھڑے بندیاں وجود میں آنا شروع ہو جاتی ہیں۔ مرکزی قیادت سے اختلافِ رائے اور انا پرستی بڑے مشن سے علیحدگی تک کے راستے پر چلا دیتی ہے۔

دوسرا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ یہ لوگ تحریک کے مخالفین یا تحریک کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنے والوں کی توجہ کا مرکز بن جاتے ہیں۔ یہ مخالف لوگ جماعتی ساکھ اور خداداد صلاحیتوں والے لوگوں کو اپنے مقصد کے لیے دام ہم رنگ زمین بچھا کر استعمال کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ جن لوگوں کو یہ استعمال کرنا چاہتے ہیں اگر ان میں کسی پہلو سے کمزوری پہلے سے موجود ہے تو یہ ذیلی قیادتیں ان فتنوں کا شکار ہو کر بڑی اجتماعیت اور عام کارکنوں کے لیے مشکلات پیدا کر دیتی ہیں۔ مالدار لوگ ان ذیلی قیادتوں کو احسانات میں جکڑ لیتے ہیں جس کی وجہ سے وہ ان کے اخلاقی دباؤ سے نکل نہیں سکتے۔ غیر محسوس طریقے سے ایسا دباؤ ڈالتے ہیں کہ یہ ان کی خواہشات کے ترجمان بن جاتے ہیں۔

باوسائل لوگوں کا ان کے گرد جمع ہو جانا اور ذیلی قیادتوں کی زبان آوری ان کو عام کارکنوں کے مدِمقابل کھڑا کر دیتی ہے۔ یہ اپنے آپ کو شے دگر سمجھ کر جماعت اور عام کارکنوں کے لیے فتنہ بن جاتے ہیں اور کسی کے سمجھانے پر بھی اپنے حالات پر غور کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ وہ عام کارکن جنہوں نے ان کی شخصیت کو نمائندگی بخشنے میں محنت کی ہوتی ہے وہ ان کی نظر میں نکمے اور حقیر بن جاتے ہیں۔ اقامت دین کا کام کرنے والی مرکزی قیادت ایسے فتنوں کا مقابلہ صرف اس کام پر یکسو ہو کر ہی کر سکتی ہے جسے سورۃ الشوریٰ میں واضح فرمایا گیا:

﴿فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ۚ وَاسْتَقِمْ كَمَاۤ اُمِرْتَ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ ۚ وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَاۤ

اَنۡزَلَ اللّٰهُ مِنۡ كِتٰبٍ ۚ وَاُمِرۡتُ لِاَعۡدِلَ بَيۡنَكُمۡ ؕ اَللّٰهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمۡ ؕ لَنَاۤ اَعۡمَالُنَا وَلَكُمۡ اَعۡمَالُكُمۡ ؕ لَا حُجَّةَ بَيۡنَنَا وَبَيۡنَكُمۡ ؕ اَللّٰهُ يَجۡمَعُ بَيۡنَنَا ۚ وَاِلَيۡهِ الۡمَصِيۡرُ ﴿۱۵﴾

''(تو اے نبی ﷺ!) آپؐ اسی کی دعوت دیتے رہیے' اور جمے رہیے جیسا کہ آپؐ کو حکم دیا گیا ہے' اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کیجیے' اور آپؐ کہہ دیجیے کہ میں تو اس کتاب پر ایمان لایا ہوں جو اللہ تعالیٰ نے نازل کی ہے' اور مجھے حکم ہوا ہے کہ میں تمہارے درمیان عدل کروں۔ اللہ ہمارا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے' ہمارے لیے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لیے تمہارے اعمال ہیں۔ ہمارے درمیان کسی حجت بازی کی ضرورت نہیں' اللہ ہمیں جمع کر دے گا اور اسی کی طرف سب کو لوٹنا ہے۔''

(نوٹ: اس آیت کی تفسیر ''تفسیر عثمانی'' میں دیکھنے کے لائق ہے۔)

﴿وَلَا تَتَّبِعۡ اَهۡوَآءَهُمۡ ۚ﴾ کا حکم قرآن مجید میں بہ تکرار ملتا ہے۔ یہ کون لوگ ہیں جن کی خواہشات کی پیروی سے اللہ تعالیٰ نے روکا ہے؟ یہ وہی لوگ ہیں جن کو معاشی' معاشرتی اور سیاسی مفادات کی دوڑ جیتنے کے لیے باصلاحیت' تازہ دم گھوڑوں کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ ان پر سوار ہو کر وہ نا صرف خرچ کیا ہوا سرمایہ واپس لے سکیں بلکہ مستقل منافع کے حصول کے دروازے بھی کھل جائیں۔

تاریخ اہلِ ثروت و اختیار کی ایسی کوششوں سے بھری پڑی ہے۔ ائمہ دین نے ان کو سمجھا ہے اور دین کی سربلندی کی فکر کی یکسوئی نے انہیں ایسی قوتوں کا شکار بننے سے محفوظ رکھا ہے' اگرچہ اس کے لیے انہیں آزمائشوں سے گزرنا پڑا ہے۔ اقامتِ دین کی جدوجہد کرنے والی قیادت کو اس طرح کے فتنوں سے بچنے کے لیے اور اپنے کارکنوں کو بچانے کے لیے ہر وقت اسی ہدایت کو پیش نظر رکھنا اور اس پر عمل پیرا ہونا ہوگا:

﴿فَلِذٰلِكَ فَادۡعُ ۚ وَاسۡتَقِمۡ كَمَاۤ اُمِرۡتَ ۚ﴾

یہ اقامتِ دین کی صدا مثل صدائے جرسِ ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام ہے' جو خالی نہیں لوٹ سکتی۔ ع تنہا نہیں لوٹی کبھی آواز جرس کی!

یہی وہ دعوت ہے جو عالمی سطح پر سنی جا سکتی ہے' جس پر لبیک کہنے والے لوگ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کے لیے صف بندی کر سکتے ہیں۔ (واضح رہے کہ یہ ساری باتیں ذیلی قیادتوں کے حوالے سے ہو رہی ہیں۔ براہِ کرم انہیں اسی پس منظر میں دیکھا اور سمجھا جائے۔) ❁❁

شعبہ خط و کتابت کورسز کی تاریخ میں ایک اور سنگِ میل کا اضافہ!!

آن لائن کورس

- کیا آپ جاننا چاہتے ہیں؟ از روئے قرآن ہماری دینی ذمہ داریاں کیا ہیں؟ نیکی اور تقویٰ اور جہاد اور قتال کی حقیقت کیا ہے؟
- کیا آپ دین کے جامع اور ہمہ گیر تصور سے واقفیت حاصل کرنا چاہتے ہیں؟
- کیا آپ قرآن حکیم کی فکری اساس اور بنیادی عملی ہدایات سے روشناس ہونا چاہتے ہیں؟
- کیا آپ نجی مجالس میں اسلام پر ہونے والی تنقید کا مناسب اور مدلل جواب دینے کی اہلیت حاصل کرنا چاہتے ہیں؟

تو

صدر مؤسس مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور ڈاکٹر اسرار احمد مرحوم و مغفور کے مرتب کردہ

''مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب'' پر مبنی

''قرآن حکیم کی فکری و عملی راہنمائی کورس'' سے استفادہ کیجیے

یہ کورس (جو ایک عرصہ سے بذریعہ خط و کتابت کروایا جا رہا ہے) شائقین علوم قرآنی کی دیرینہ خواہش پر

الحمدللہ!

اب یکم ستمبر 2016ء سے آن لائن (ONLINE) بھی شروع ہو چکا ہے

برائے رابطہ: انچارج شعبہ خط و کتابت کورسز' قرآن اکیڈمی' K-36' ماڈل ٹاؤن لاہور

فون: 3-35869501 (92-42) E-mail:distancelearning@tanzeem.org

کرو مہربانی تم اہلِ زمیں پر!

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

شیخ سعدیؒ کا بہت پیارا شعر ہے ؎

یارب تو کریمی و رسولِ تو کریم
صد شکر کہ ہستیم میانِ دو کریم

''اے پروردگارِ عالم! تو بھی کریم (مہربان) ہے اور تیرا رسول بھی کریم ہے۔ ہم سو بار تیرے شکرگزار ہیں کہ ہم ان دو کریم ہستیوں کے درمیان ہیں۔''

اللہ تعالیٰ خالق کائنات ہے اور وہ اپنی مخلوق پر انتہائی مہربان ہے۔ رحمٰن اور رحیم اس کے صفاتی نام ہیں جو قرآن مجید میں بار بار آئے ہیں۔ اس کی ہر صفت بے پایاں ہے مگر رحمٰن اور رحیم اس کے نمایاں نام ہیں۔ مخلوق کا ہر فرد اس کی رحمت کا محتاج ہے۔ مسلمان کو حکم ہے کہ وہ جب کوئی نیک کام شروع کرے تو سب سے پہلے رحمٰن اور رحیم اللہ کا نام لے یعنی بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ کہے۔ کائنات میں اللہ تعالیٰ کی رحمت ہر جگہ اور ہر وقت جلوہ گر ہے۔ خود اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کی وسعت کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے: ﴿وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ﴾ (الاعراف:۱۵۶) ''اور میری رحمت ہر چیز کو شامل ہے''۔ اس کا ہر کام رحمت کا مظہر ہے۔ مسلمانوں کو بتایا گیا ہے کہ اپنی دعاؤں میں کہیں: ﴿وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ﴾ (المؤمنون) ''اور تو سب رحم کرنے والوں میں سب سے بہتر رحم کرنے والا ہے''۔ قرآن مجید میں بار بار آیا ہے: ﴿هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ﴾ (الحشر) ''وہی رحم کرنے والا مہربان ہے''۔ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کے ہر فرد پر رحم کرنے والا ہے۔ اس نے کائنات میں ہر طرف اپنی رحمت کے آثار پھیلا رکھے ہیں۔ حدیث میں ہے کہ اللہ ربّ العزت نے رحمت کے سو حصے کیے جن میں سے ننانوے حصے اپنے پاس رکھ لیے اور زمین پر صرف ایک حصے کو اتارا اور اسی ایک حصے کی بنا پر لوگ ایک دوسرے پر رحم کرتے ہیں' یہاں تک کہ گھوڑا اس خوف سے اپنے

بچے پر پاؤں نہیں رکھتا کہ کہیں اس کو ضرر نہ پہنچ جائے۔ (صحیح البخاری' کتاب الادب)

اللہ تعالیٰ انسانوں پر سب سے زیادہ مہربان ہے۔ اس نے بتا رکھا ہے کہ تمام انسانوں کو اس لیے دنیا میں بھیجا گیا ہے تاکہ دیکھے کہ کون اچھے عمل کرتا ہے۔ مرنے کے بعد انسان کی آخرت کی زندگی شروع ہو جاتی ہے' جہاں اسے اپنے اچھے برے اعمال کا بدلہ ملے گا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی انسانوں پر رحمت ہے کہ وہ ان کی ہدایت کے لیے انبیاء و رسل علیہم السلام کو بھیجتا رہا ہے کہ وہ لوگوں کو خالق کائنات سے متعارف کرائیں' انہیں اچھائیوں کی تعلیم دیں اور بُرے کاموں سے روکیں تاکہ مرنے کے بعد شروع ہونے والی زندگی میں وہ اللہ تعالیٰ کی ابدی نعمتوں سے سرفراز ہوں اور اس کے عذاب اور سزا سے بچ سکیں۔ تمام پیغمبر انسانوں پر اللہ تعالیٰ کی رحمت تھے اور سب سے آخر پر لوگوں کی ہدایت کے لیے مبعوث ہونے والے محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رحمۃ للعالمین ہیں۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾ (الانبیاء) ''نہیں بھیجا ہم نے آپؐ کو مگر جہانوں کے لیے رحمت بنا کر''۔ فرشتے انبیاء پر ایمان لانے والے لوگوں کے حق میں رحمت کی دعا کرتے ہیں: ﴿وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ ''اور وہ فرشتے استغفار کرتے ہیں ایمان والوں کے لیے''۔ فرشتے اپنی دعاؤں میں کہتے ہیں: ﴿رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا﴾ ''اے ہمارے پروردگار! تو نے اپنی رحمت اور علم میں ہر چیز کو سما لیا ہے'' ﴿فَاغْفِرْ لِلَّذِيْنَ تَابُوْا وَاتَّبَعُوْا سَبِيْلَكَ وَقِهِمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ ۝ رَبَّنَا وَاَدْخِلْهُمْ جَنّٰتِ عَدْنِ ِالَّتِيْ وَعَدْتَّهُمْ.....﴾ (المؤمن) ''پس معاف کر ان کو جو توبہ کریں اور چلیں تیری راہ پر اور بچا ان کو آگ کے عذاب سے۔ اے ہمارے رب داخل کر ان کو سدا بہار باغوں میں جن کا تو نے ان سے وعدہ فرمایا ہے.....''

یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے کہ اس نے انسانوں کو اچھائی اور بُرائی کا شعور دیا۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے کہ اس نے فجور اور تقویٰ کی پہچان انسان کی فطرت میں رکھ دی۔ گویا اللہ تعالیٰ نے ہر اعتبار سے انسان کو حصولِ کامیابی کی راہ دکھا دی اور یہ سراسر اس کی رحمت کا مظہر ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی انسانیت کے لیے اُسوۂ حسنہ ہے اور ہمہ جہت رحمت ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ انسانوں کے لیے مشعلِ راہ ہے۔ اس میں رحمت کا جذبہ اختیار کرنے کا حکم بھی ہے اور نمونہ بھی۔ آپؐ نے رحم دلی کے ساتھ انسانوں کو راہِ ہدایت دکھائی۔

آپؐ بچوں پر شفقت فرماتے اور بڑوں کی عزت کرتے۔ آپؐ کو طرح طرح سے ستایا گیا مگر آپؐ نے کسی سے انتقام نہیں لیا۔ آپؐ نے خون کے پیاسوں کو بھی معاف کر دیا۔ آپؐ چاہتے تھے کہ ایمان لا کر سب لوگ ہدایت پر آ جائیں، مگر یہ آپؐ کے اختیار میں نہ تھا، اس لیے کہ ہادیٔ برحق تو صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ آپؐ انتہائی شفقت اور محبت کے ساتھ لوگوں کو راہِ حق کی طرف بلاتے رہے، مگر قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا:

﴿اِنَّكَ لَا تَهْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ ۚ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِیْنَ ﴿۵۶﴾﴾ (القصص)

''(اے نبی ﷺ!) بے شک آپ راہِ ہدایت پر نہیں لا سکتے جس کو چاہیں، بلکہ اللہ راہ پر لاتا ہے جس کو چاہے، اور وہی خوب جانتا ہے راہِ ہدایت پر آنے والوں کو۔''

چنانچہ آپ ﷺ کی نہایت مؤثر اور دلسوز کوشش کے باوجود آپؐ کے شفیق چچا ابوطالب ایمان نہ لائے اور آپؐ کی رحمت سے فائدہ نہ اٹھا سکے، جب کہ دوسرے چچا (ابولہب) نے زندگی بھر آپؐ کی مخالفت کی اور اذیت دیتا رہا۔

رسول اللہ ﷺ بچوں اور بڑوں سب کے ساتھ انتہائی شفیق اور رحیم تھے۔ بچوں کے ساتھ پیار کرتے، محبت کے ساتھ انہیں خود سلام کرتے اور آداب سکھاتے۔ ایک دفعہ آپؐ نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا بوسہ لیا۔ اقرع بن حابس رضی اللہ عنہ جو تند خُو بدو تھے، پاس بیٹھے ہوئے تھے، کہنے لگے: ''میرے دس بچے ہیں، میں نے کبھی ان میں سے کسی کا بوسہ نہیں لیا''۔ آپ ﷺ نے اُن کی طرف دیکھ کر فرمایا: ''جو شخص رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔'' (متفق علیہ)

ایک اور بدو نے رسول اللہ ﷺ سے کہا کہ آپؐ بچوں کو چومتے ہیں، لیکن ہم لوگ تو نہیں چومتے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے جب تمہارے دل سے رحم کو نکال لیا تو میرا کیا زور ہے!'' (بخاری، کتاب الادب)

ایک دفعہ ایک شخص اپنے بچے کو ساتھ لے کر رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور اس کے ساتھ پیار کرنے لگا۔ آپؐ نے یہ حالت دیکھی تو فرمایا: ''تم اس پر رحم کرتے ہو؟'' اس نے کہا: ہاں! ارشاد ہوا: ''اللہ تعالیٰ تم پر اس سے زیادہ رحم کرنے والا ہے جس قدر تم اس بچے پر رحم کرتے ہو اور وہ سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والا ہے''۔ (بخاری، کتاب الادب)

اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ایک زانو پر مجھے اور دوسرے پر

حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو بٹھا لیتے تھے۔ پھر دونوں زانو کو ملا کر کہتے تھے کہ اے ربّ! ان دونوں پر رحم کر، کیونکہ میں ان دونوں پر رحم کرتا ہوں۔ (بخاری، کتاب الادب)

قریش نے آپ ﷺ کو بہت ستایا، برا بھلا کہا، مذاق اڑایا، سب وشتم کیا، مگر آپؐ نے کبھی انتقام نہیں لیا۔ جب آپ ﷺ دعوت و تبلیغ کے لیے طائف گئے تو وہاں کے لوگوں نے آپؐ کے ساتھ بہت بُرا سلوک کیا، آپؐ کو گالیاں دیں، لڑکوں کو پیچھے لگا دیا جنہوں نے آپؐ کو پتھروں کے ساتھ زخمی کر دیا۔ کہا گیا کہ آپؐ ان سرکشوں اور ظالموں کے حق میں بددعا کریں تو آپ ﷺ نے جواب میں کہا کہ میں تو رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ اگر یہ لوگ مجھے نہیں پہچانتے تو ان کی اولاد مجھے پہچانے گی۔ اور پھر آپ ﷺ نے اُن کے حق میں ہدایت کی دعا کی۔

ایک شخص کی کچھ رقم رسول اللہ ﷺ کے ذمہ تھی۔ ابھی معاہدے کے مطابق اس رقم کی ادائیگی کا وقت نہیں آیا تھا کہ اُس نے آ کر بڑی بدتمیزی کے ساتھ تقاضا کیا اور کہا کہ تم بنی ہاشم ادائیگی کے معاملے میں بُرے ہو۔ اُس نے آپ ﷺ کی گردن کے گرد کپڑا ڈال کر زور سے کھینچا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اُسے سبق سکھانا چاہا مگر آپ ﷺ نے ان کو روک دیا اور فرمایا: ''اُس کو کہو کہ سلیقے کے ساتھ مانگے اور مجھے کہو کہ میں اُس کا قرض چکا دوں۔''

حضرت ابومسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ میں اپنے غلام کو مار رہا تھا کہ پیچھے سے آواز آئی: ''جان لو، جان لو!'' میں نے مڑ کر دیکھا تو رسول اللہ ﷺ تھے۔ فرما رہے تھے: ''اے ابومسعود! جتنا اختیار تم کو اس غلام پر ہے اس سے زیادہ اللہ تعالیٰ کو تم پر ہے''۔ ابومسعودؓ کہتے ہیں کہ آپؐ کی اس نصیحت کا مجھ پر یہ اثر ہوا کہ میں نے پھر کبھی کسی غلام کو نہیں مارا۔

آپ ﷺ کو ظلم اور زیادتی سخت ناپسند تھی۔ یہ آپؐ کی رحم دلی کا تقاضا تھا۔ ایک شخص آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! میں اپنے خادم کا قصور کتنی دفعہ معاف کروں؟ آپؐ نے اس کو کوئی جواب نہ دیا بلکہ خاموش رہے۔ اس نے پھر وہی عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! میں اپنے خادم کو کتنی دفعہ معاف کروں؟ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''ہر روز ستر مرتبہ۔'' (جامع ترمذی)

حضرت انس رضی اللہ عنہ دس سال تک آپؐ کی خدمت میں رہے، وہ بیان کرتے ہیں کہ میں سفر و حضر میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں رہا۔ (حضور ﷺ اتنے نرم مزاج اور رحیم تھے کہ) اگر

میں نے کوئی کام کیا تو حضور ﷺ نے کبھی مجھے یہ نہ فرمایا کہ تو نے یہ کام اس طرح کیوں کیا؟ اور اگر میں نے کوئی کام نہ کیا تو آپ ﷺ نے کبھی مجھے یہ نہ فرمایا کہ تم نے یہ کام کیوں نہیں کیا؟

حضور ﷺ کا فرمان تھا کہ دشمنوں کے ساتھ جنگ ہو تو اُن کے بچوں، بوڑھوں اور عورتوں پر ہاتھ نہ اٹھایا جائے۔ اگر قبیلے کا سردار قیدی بن کر ہاتھ آئے تو اس کے مرتبے کا خیال رکھا جائے۔ عام قیدیوں اور غلاموں کے ساتھ اس درجہ حسن سلوک کیا جائے کہ جو خود کھاؤ وہی ان کو کھلاؤ اور جو خود پہنو وہی ان کو پہناؤ۔

رسول اللہ ﷺ نے نجد کے علاقے کی طرف کچھ سوار بھیجے تو وہ بنی حنیفہ کے ایک شخص کو پکڑ لائے جس کا نام ثمامہ بن اثال تھا۔ صحابہؓ نے اسے مسجد نبویؐ کے ایک ستون کے ساتھ باندھ دیا۔ رسول اللہ ﷺ اس کی طرف تشریف لائے اور فرمایا ثمامہ کو چھوڑ دو۔ ثمامہ حضور ﷺ کی اس مہربانی سے اتنا متاثر ہوا کہ اسی وقت کھجور کے ایک درخت کی طرف گیا جو مسجد کے قریب ہی تھا، غسل کیا، پھر مسجد میں داخل ہوا اور کلمہ شہادت پڑھ کر مسلمان ہو گیا۔ (بخاری)

رسول اللہ ﷺ کی رحم دلی کے بہت سے واقعات لوگوں کے اسلام قبول کرنے کا سبب بنے۔

رسول اللہ ﷺ تمام جہانوں کے لیے رحمت تھے۔ آپؐ کی رحمت صرف انسانوں تک محدود نہ تھی، بلکہ آپؐ سب جانداروں کے لیے رحم کا جذبہ رکھتے تھے۔ حضرت عبد اللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اَلرَّاحِمُوْنَ یَرْحَمُهُمُ الرَّحْمٰنُ، اِرْحَمُوْا مَنْ فِی الْاَرْضِ یَرْحَمْكُمْ مَنْ فِی السَّمَاءِ)) (رواہ ابوداؤد والترمذی، عن عبد اللّٰہ بن عمروؓ)

''رحم کرنے والوں اور ترس کھانے والوں پر بڑی رحمت والا رحم کرے گا۔ زمین پر رہنے بسنے والی مخلوق پر تم رحم کرو تو آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔''

اس حدیث نبویؐ کے مضمون کو اردو میں بایں الفاظ شعر کی صورت میں پیش کیا گیا ہے:

کرو مہربانی تم اہلِ زمیں پر
خدا مہرباں ہو گا عرشِ بریں پر!

یعنی اللہ کی خاص رحمت کے مستحق وہی لوگ ہیں جو انسانوں کے علاوہ اللہ کی دوسری مخلوق کے لیے بھی رحم دل ہوں۔ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ سے مروی ایک حدیث کے الفاظ اس طرح ہیں: ((اَلْخَلْقُ عَیَالُ اللّٰهِ، فَاَحَبُّ الْخَلْقِ اِلَی اللّٰهِ مَنْ اَحْسَنَ اِلٰی عَیَالِهٖ)) (رواہ البیہقی)

''ساری مخلوق اللہ تعالیٰ کا کنبہ ہے، پس مخلوق میں سے اللہ تعالیٰ کا محبوب ترین بندہ وہ ہے جو اُس کے کنبے کے افراد کے ساتھ حسن سلوک کرے''۔ انسانوں کے علاوہ مخلوقات کے تمام جاندار، چرند، پرند، چوپائے بھی اللہ تعالیٰ کے کنبے کے افراد ہیں۔ چنانچہ ان کے ساتھ بھی بھلائی کرنے اور ان پر رحم کرنے کا حکم ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ایک آدمی راستہ چلا جا رہا تھا، اُسے سخت پیاس لگی، چلتے چلتے اُسے ایک کنواں ملا، وہ اس کے اندر اُترا اور پانی پی کر باہر نکل آیا۔ کنویں کے اندر سے نکل کر اُس نے دیکھا کہ ایک کُتا ہے جس کی زبان باہر نکلی ہوئی ہے اور پیاس کی شدت سے وہ کیچڑ چاٹ رہا ہے۔ اُس آدمی نے دل میں کہا کہ اس کُتے کو بھی پیاس کی ایسی ہی تکلیف ہے جیسی کہ مجھے تھی، اور وہ اُس کُتے پر رحم کھا کر پھر اُس کنویں میں اُترا اور اپنے چمڑے کے موزے میں پانی بھر کر اُس کو اپنے منہ سے تھاما اور کنویں سے باہر نکل آیا، اور اُس کُتے کو وہ پانی پلا دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اُس کی اس رحمدلی اور اس محنت کی قدر کی اور اسی عمل پر اُس کی بخشش کا فیصلہ فرما دیا''۔ بعض صحابہ نے حضور ﷺ سے یہ واقعہ سن کر دریافت کیا: یارسول اللہ ﷺ! کیا جانوروں کی تکلیف دور کرنے میں بھی ہمارے لیے اجر و ثواب ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہاں! ہر زندہ اور ترجگر رکھنے والے جانور (کی تکلیف دور کرنے) میں ثواب ہے۔'' (بخاری و مسلم)

حضرت عبد اللہ بن جعفرؓ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ ایک انصاری صحابی کے باغ میں تشریف لے گئے، وہاں ایک اونٹ تھا۔ جب اُس اونٹ نے آپ ﷺ کو دیکھا تو ایسا ڈکرایا اور ایسی دردبھری آواز نکالی جیسی بچے کے جدا ہونے پر اونٹنی کی آواز نکلتی ہے، اور اُس کی آنکھوں سے آنسو بھی جاری ہو گئے۔ رسول اللہ ﷺ اُس کے قریب تشریف لے گئے اور آپ نے اس کی کنوتیوں پر اپنا دستِ شفقت پھیرا (جیسے کہ گھوڑے یا اونٹ پر پیار کرتے وقت ہاتھ پھیرا جاتا ہے)، وہ اونٹ خاموش ہو گیا۔ پھر آپؐ نے دریافت فرمایا کہ یہ اونٹ کس کا ہے؟ اس کا مالک کون ہے؟ ایک انصاری نوجوان آئے اور انہوں نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! یہ اونٹ میرا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اس بیچارے بے زبان جانور کے بارے میں تم اس اللہ سے ڈرتے نہیں جس نے تم کو اس کا مالک بنایا ہے! اس نے

مجھے شکایت کی ہے کہ تم اس کو بھوکا رکھتے ہو اور زیادہ کام لے کر اس کو بہت تکلیف پہنچاتے ہو۔'' (سنن ابی داؤد)

جس طرح حضرت سلیمان علیہ السلام معجزانہ طور پر پرندوں کی بولی سمجھ لیتے تھے اسی طرح حضور اکرم ﷺ نے اونٹ کی شکایت سمجھ لی اور اونٹ کے مالک کو ہدایت کی کہ اسے کافی خوراک دیا کرے اور اس سے زیادہ مشقت نہ لے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے عبدالرحمٰن رحمہ اللہ اپنے والد ماجد سے روایت کرتے ہیں کہ ایک سفر میں ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے' آپ قضاء حاجت کے لیے تشریف لے گئے' اس اثناء میں ہماری نظر ایک سرخ چڑیا پر پڑی' جس کے ساتھ اس کے دو چھوٹے چھوٹے بچے بھی تھے۔ ہم نے ان بچوں کو پکڑ لیا' وہ چڑیا آئی اور ہمارے سروں پر منڈلانے لگی۔ اتنے میں رسول اللہ ﷺ تشریف لے آئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''کس نے اس کے بچے پکڑ کے اسے ستایا ہے؟ اس کے بچے اس کو واپس کر دو''۔ اور آپ ﷺ نے چیونٹیوں کی ایک بستی دیکھی (یعنی زمین کا ایک ایسا ٹکڑا جہاں چیونٹیوں کے بہت سوراخ تھے اور چیونٹیوں کی بہت کثرت تھی) ہم نے وہاں آگ لگا دی تھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''کس نے ان کو آگ سے جلایا ہے؟'' ہم نے عرض کیا: یارسول اللہ (ﷺ) ہم نے ہی آگ لگائی ہے۔ آپ نے فرمایا: ''آگ کے پیدا کرنے والے اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کے لیے یہ سزاوار نہیں ہے کہ وہ کسی جاندار کو آگ کا عذاب دے۔'' (سنن ابوداؤد)

اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کو چڑیا کے بچے پکڑنے سے منع کیا۔ چونکہ ہر جاندار کو اپنے بچوں سے محبت ہوتی ہے' لہٰذا آپ نے چڑیا کے بچوں کو واپس کرنے کا حکم فرمایا۔ ایسا بھی ہوا کہ آپ ﷺ کے ساتھیوں نے چیونٹیوں کی ایک بستی پر آگ لگا دی تو آپ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو چیونٹیوں کے گھر جلانے پر سرزنش کی اور فرمایا کہ آگ کے پیدا کرنے والے اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ کسی جاندار کو آگ کا عذاب دے۔

جس طرح کسی مصیبت زدہ انسان یا جانور کی مصیبت دور کرنا ایسا پسندیدہ عمل ہے کہ وہ انسان کی بخشش کا سبب بن سکتا ہے' اسی طرح جو شخص کسی انسان یا حیوان کو جانتے بوجھتے اذیت میں مبتلا کرے وہ اللہ تعالیٰ کے غصے کو دعوت دیتا ہے کہ اس نے اللہ تعالیٰ کے کنبے کے فرد کو تکلیف

دے کر مالک کو ناراض کیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمایا: ''ایک بے درد اور بے رحم عورت اس لیے جہنم میں گرائی گئی کہ اُس نے ایک بلی کو باندھ کے (بھوکا مار ڈالا) نہ تو اُسے خود کچھ کھانے کو دیا اور نہ اُسے چھوڑا کہ وہ زمین کے کیڑے مکوڑوں سے اپنی غذا حاصل کر لیتی۔'' (بخاری و مسلم) اس بے رحم اور بے درد عورت نے ایک بلی کو بھوکا پیاسا رکھ کر مار دیا۔ اُس کا یہ فعل اللہ تعالیٰ کو اس قدر بُرا لگا کہ اس عورت کو جہنم میں ڈال دیا گیا۔

حلال جانوروں کا شکار کرنے اور ان کا گوشت کھانے کی اجازت ہے' کیونکہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کی تمام چیزیں انسان کے لیے مسخر کی ہیں اور انسان ان چیزوں سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ زندہ حلال جانور کو ذبح کر کے کھانا درست ہے' لیکن یہاں بھی حکم یہ ہے کہ جانور کو ذبح کرنے سے پہلے بھوکا پیاسا نہ رکھا جائے۔ ذبح اس طرح کیا جائے کہ اسے کم سے کم تکلیف ہو۔ ذبح کرنے کی چھری پہلے سے خوب تیز کر لی گئی ہو۔ جب تک جانور تڑپ رہا ہو اس کی کھال نہ کھینچی جائے۔

کتوں اور مرغوں کو لڑانے کا مشغلہ اسلام میں ناپسندیدہ ہے۔ البتہ مفید گھریلو جانوروں کو پالنا درست ہے اور اگر کسی پرندے کو پنجرے میں بند کر کے رکھا جائے اور اُسے اس کی پسندیدہ غذا مہیا کی جائے تو جائز ہے۔ گناہ تو اس وقت ہے جب اسے بھوکا پیاسا رکھا جائے۔ چڑیا گھر میں جانوروں کا رکھنا بھی قابلِ اعتراض نہیں' کیونکہ وہاں ان کی خوراک اور سہولت کا اچھا انتظام کیا جاتا ہے اور چند جانوروں کو وہاں قید اس لیے رکھا جاتا ہے تاکہ انسانوں کی تفریح کا سامان کیا جائے۔ سچ ہے کہ دنیا کی تمام چیزیں انسان کی خدمت کے لیے پیدا کی گئی ہیں' وہ جائز طریقے سے ان سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ جب قیامت برپا کی جائے گی' اور تمام انسان مر جائیں گے تو انسان کے لیے پیدا کی گئی تمام چیزیں بھی فنا کر دی جائیں گی۔ نہ چرند' پرند اور دیگر جانور رہیں گے نہ جنگل' پہاڑ اور سمندر قائم رہیں گے۔ کیونکہ نہ انسان رہیں گے اور نہ پھر ان چیزوں کا کوئی مصرف ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں تمام مخلوقات پر رحم کرنے والا اور ان کے لیے آسانی والے معاملات کرنے والا بنائے۔ آمین یاربّ العالمین!

❁ ❁ ❁

نسوانیتِ زن کا نگہباں ہے فقط مرد

بیگم ڈاکٹر عبدالخالق

اسلام نے عورت کو جو حقوق دیے ہیں وہ پتھر کے زمانے سے لے کر‘ جاہلیتِ قدیمہ تا جاہلیتِ جدیدہ نہ کوئی دے سکا ہے اور نہ کبھی کوئی دے سکے گا۔ موجودہ دور میں پوری دنیا میں عورت کی آزادی اور مساوات کے نام پر عورت کا استحصال ہو رہا ہے‘ عزت و ناموس کی دھجیاں بکھیر کر بھی اور اُس کو اُس کے مقام سے گرا کر بھی۔ نہ ذاتی طور پر تقدس رہا‘ نہ رشتوں میں تقدس اور نہ بحسابِ تخلیق اُس سے کوئی انصاف ہو رہا ہے۔ حالانکہ عام فہم بات ہے کہ جو چیز جس مقصد کے لیے بنائی جاتی ہے اس سے وہی کام لیا جاتا ہے اور اسے وہی مقام دیا جاتا ہے جس کا وہ اہل ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ہم بھیڑ بکری کو بار برداری کے کام میں نہیں جھونک سکتے اور نہ آج تک ایسا ہوا ہے کہ بھیڑ بکری جیسے نازک جانور پر کسی نے بوجھ لاد کر سڑکوں پر نکال دیا ہو۔ یہ عقلی طور پر بھی ناقابل فہم ہے اور اخلاقی طور پر بھی ظلم۔ ظاہر بات ہے کہ جو جانور بار برداری کے قابل ہیں مثلاً گدھا‘ گھوڑا‘ بیل وغیرہ‘ انہیں ہی میدان میں لایا جا سکتا ہے اور مختلف کاموں میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ یہ اپنی ساخت کے حساب سے سخت جان اور محنت کش ہوتے ہیں‘ لہٰذا ان کا مقام بھی گھر نہیں بلکہ باہر ہے۔

یقیناً سب کی نظر میں یہ عام فہم اور منطقی بات ہے جس سے کسی کو کوئی اختلاف نہیں ہو سکتا‘ نہ پہلے کبھی ہوا ہے اور نہ آئندہ کبھی ہوگا‘ لیکن افسوس کہ پوری دنیا کے مرد مل کر عورت کو اس کا مقام نہیں دلا سکے۔ حالانکہ عورتوں کی جسمانی ساخت اور صلاحیتوں کے اعتبار سے مرد کے مقابلے میں ان کے کاموں کے انداز میں بھی فرق ہے اور ان کے مقام میں بھی فرق ہے۔ دونوں کی ساخت میں کچھ ایسی جبلتیں اور ایسے قدرتی قوانین کارفرما ہیں کہ جنہیں کوئی جھٹلا نہیں سکتا۔ دونوں کی صلاحیتوں اور دائرۂ کار میں اسی طرح فرق ہے جس طرح گدھے گھوڑے اور بھیڑ بکری میں ہے‘ اور یہ فاطرِ فطرت کا نظام ہے جس کو بدلا نہیں جا سکتا۔ دونوں کی عقل‘

جذبات‘ دائرۂ کار اور حقوق و فرائض میں جو اعتدال اور توازن اسلام نے دیا ہے وہ دنیا کا کوئی نظام دینا ہی نہیں چاہتا۔ دورِ حاضر نے مَردوں کی عقل پر بھی پردے ڈال رکھے ہیں اور عورت کی مَت بھی ماری ہوئی ہے۔

آج معاشرتی سطح پر سب سے زیادہ عدمِ توازن اور زیادتی مرد و عورت کے مابین توازن میں ہو رہی ہے۔ کاش ہم سب جان لیں کہ پورے معاشرے کی بنیادی اینٹ ایک مرد اور ایک عورت ہے۔ وہ ٹھیک ہوں تو معاشرہ ٹھیک ہوتا ہے اور اگر وہ بگڑ جائیں تو نسلیں بگڑ جاتی ہیں‘ جیسا کہ اب مسلمانوں کا حال ہو چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مرد و عورت میں جو فرق رکھا ہے‘ اس میں دائرۂ کار کا فرق تو ہے ہی‘ لیکن عقلی طور پر مَردوں کو زیادہ مقام دیا گیا ہے اور جذباتی طور پر عورت کا نام پہلے آتا ہے۔ اسی طرح مرد مردِ میدان ہے تو عورت مردِ میدان کی آغوش اور چراغِ خانہ ہے‘ اور یہ بہت بڑی سعادت ہے جو عورت کو حاصل ہے۔ ’عورت‘ کا مطلب ہی چھپائی جانے والی چیز ہے‘ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ چھپ کر بیٹھ جائے‘ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کو چادر اور چار دیواری کے ذریعے تحفظ دیا گیا ہے تو وہ اپنی تمام تر صلاحیتوں کو پسِ چادر و چار دیواری بروئے کار لا کر اپنا نام روشن کر سکتی ہے۔ بہترین مرد (شوہر‘ باپ‘ بیٹے‘ بھائی وغیرہ) بھی درحقیقت بہترین عورت اور اس کی صلاحیتوں کے کہیں نہ کہیں مرہونِ منت ہوتے ہیں۔ بقول علامہ اقبال ؎

بتولےؓ باش و پنہاں شو ازیں عصر
کہ در آغوشِ شبیرےؓ بگیری!

ہندوؤں میں سورج کو باپ اور چاند کو ماں کہا جاتا ہے۔ سورج دن میں روشن رہتا ہے جبکہ چاند اندھیرے میں چمکتا ہے۔ بالکل اسی طرح خاتون کا کردار بھی یہ ہے کہ وہ چادر اور چار دیواری کا لحاظ رکھ کر اپنی صلاحیتیں منوا سکتی ہے۔ لیکن المیہ یہ ہے کہ جس طرح چاند دن میں اپنی قدر کھو دیتا ہے‘ بے حیثیت ہو جاتا ہے حالانکہ موجود ہوتا ہے‘ بالکل اسی طرح عورت بھی شمع محفل بن کر اپنی قدر کھو دیتی ہے۔ چنانچہ آج دنیا میں اس کی کوئی قدر و منزلت نہیں ہے۔ دنیا میں ہر بڑے مقام پر عورت کہیں کہیں اور مرد ہر جگہ غالب اور حاکم ہیں اور اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ عقلی اعتبار سے مردوں کا پلڑا بھاری ہے۔ فرمانِ رسول ﷺ کو چاہے کوئی پس پشت ڈال

دے لیکن حقیقت یہی نظر آتی ہے۔ دوسری طرف جذبات واحساسات میں عورت مرد سے بڑھ کر ہوتی ہے‘ کیونکہ فاطر فطرت نے اس کی ساخت میں یہ چیز نمایاں رکھ دی ہے۔ مثبت یا منفی جذبات کے زیر اثر ہنسنا رونا‘ شکوے شکایات‘ غصہ وغیرہ‘ یہ سب جذباتی عناصر عورت کے حصے میں زیادہ رکھ دیے گئے ہیں۔

عورتوں اور مَردوں میں سب سے زیادہ فرق حقوق وفرائض کا ہے۔ مرد کے فرائض اس کی ساخت اور صلاحیتوں کے مطابق اور عورت کے فرائض اس کی جسمانی ساخت اور صلاحیتوں کے عین مطابق رکھے گئے ہیں۔ اور یہ حقوق وفرائض انسانوں نے نہیں‘ خالق مرد و زن نے رکھے ہیں۔ مرد بھائی ہو‘ بیٹا ہو‘ شوہر یا باپ ہو‘ ہر حیثیت سے عورت کی تمام ضروریات کا محافظ اور سامانِ زیست فراہم کرنے والا ہے‘ جبکہ عورت بہن‘ بیٹی‘ ماں اور بیوی کی شکل میں گھر کی رونق‘ ہمدرد‘ گھریلو امور اور خانہ داری کے معاملات میں قدرتی طور پر مہارت رکھنے والی ہوتی ہے۔ اسی طرح مرد کے مال کو احسن طریقے سے استعمال کرنے والی ہے۔

جب سے قصور شہر کی زینب کا معاملہ ہوا یہ بات بہت زیادہ منظر عام پر آ رہی ہے کہ عورت مظلوم ہے‘ اس کو کہیں بھی پورے حقوق نہیں ملے‘ عورت غیر محفوظ ہے۔ بڑے بڑے مضامین شائع ہو رہے ہیں کہ عورت کا ہر جگہ استحصال ہو رہا ہے۔ مرد بھی یہی دہائی دے رہے ہیں اور عورتیں بھی یہی واویلا مچا رہی ہیں اور ’فکر ہر کس بقدر ہمت اوست‘ کے مطابق سد باب کے طور پر عقلی اور منطقی دلائل بھی دیے جا رہے ہیں‘ جو اولاً تو صحیح اصولوں کے مطابق ہیں ہی نہیں‘ اور اگر ہوں بھی تو قوم ان کو قبول کرنے کو تیار نہیں۔ خصوصاً نوجوان نسل کی لڑکیاں۔

ہم اپنے اپنے دلائل کے حق میں ہر طرح کی مثالیں لے کر آتے ہیں‘ لیکن اسلام نے عورت کو جو مقام دیا ہے وہ مقام نہ مرد عورت کو دینا چاہتا ہے اور نہ ہی خود عورت اپنا وہ مقام چاہتی ہے۔ اس ضمن میں کسی ایک کو قصوروار نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ لیکن آج الیکٹرانک میڈیا اور پرنٹ میڈیا میں زیادہ تر اسی چیز کی دہائی دی جا رہی ہے کہ سارا قصور مرد کا ہے۔ اور یہ بھی ایک تو ہماری مغرب پرستی کا نتیجہ ہے دوسرا یہ کہ ’’مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے‘‘ کے مصداق ہم مسلمان اپنے منصب کو جو اسلام نے ہمیں دیا ہے‘ بالائے طاق رکھ کر ’’صُمٌّ بُکْمٌ عُمْیٌ‘‘ کی تصویر بنے ہوئے ہیں۔ ہماری عقل‘ سماعت‘ بصارت‘ سب کچھ خرافات بلکہ حیوانیت کا لبادہ

اوڑھ چکی ہے:

حقیقت خرافات میں کھو گئی
یہ امت روایات میں کھو گئی!

عورت کو اس کے حقوق اور مناصب بتائے جائیں تو وہ یہ سمجھتی ہے کہ عورت کو کم تر رکھا گیا ہے‘ حالانکہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ صرف ذمہ داریوں میں فرق رکھ دیا گیا ہے‘ جیسے کہ ایک انجینئر اور ایک ڈاکٹر کے کاموں میں فرق ہے۔ دونوں میں سے کم کوئی بھی نہیں‘ لیکن اگر ڈاکٹر انجینئرنگ شروع کر دے اور انجینئر ڈاکٹری سنبھال لے تو یقیناً نظامِ زندگی تباہ و برباد ہو جائے‘ بالکل ایسے ہی جیسے آج عورت اپنے دائرہ کار سے ہٹ گئی ہے تو نظامِ زندگی فتنہ وفساد کا شکار ہو چکا ہے۔ ’’اسلام کی نظر میں عورت مرد سے کسی طرح کم نہیں‘‘ یہ بات آج کی عورت کی سمجھ میں نہیں آتی‘ کیونکہ مغرب نے اسلام کو تنگ نظر بتانے کے لیے عورت کا ہی سہارا لے رکھا ہے اور عورت کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا ہے کہ اسلام عورت کو دبانا چاہتا ہے‘ چادر اور چار دیواری میں قید کرنا چاہتا ہے اور مرد اس ضمن میں اس پر ظلم کرتا ہے‘ لہٰذا آزادی کے لیے نکلو اور جو بن پڑے کرو! عورت کو اس معاملے میں مرد کی طرح پوری آزادی ہے کہ اپنے جذبات کی تسکین کے لیے جو کرنا چاہتی ہے کر گزرے۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ عورت زندگی کے ہر میدان میں بغاوت پر اُتر آئی ہے۔ کہیں آزادیٔ اظہار ولباس کے ماورائے اخلاق نعرے پر‘ کہیں عزت وناموس اور شرم وحیا کا لبادہ اتار کر‘ تعلیم اور محنت کے نام پر‘ تکبر وغرور کے لباس سے آراستہ وپیراستہ ہو کر سر بازار نکل آئی۔ عورت کی صرف ایک دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ کر مغرب نے عورت کی عقل پر گہرے پردے ڈالے ہیں اور مسلمان مردوں کو ناکوں چنے چبوا دیے ہیں۔ اگر بیٹی یا بہن کو دیکھا جائے تو گھر میں بیٹھ کر تعلیم حاصل کرنے کو معیوب سمجھتی ہے۔ بیوی ہے تو اپنے دائرہ کار یعنی گھر داری‘ شوہر داری اور بچہ داری کو بوجھ سمجھتی ہے۔ اور اگر والدہ ہے تو وہ بھی گھر میں رہنے اور بچوں کی تربیت کرنے سے عاجز اور لاچار نظر آتی ہے۔ عورتوں کو ہر مقام پر امن وعافیت کی جگہ گھر سے باہر ہی نظر آتی ہے۔ الا ماشاء اللہ! یہ تو میں عوام الناس کی بات کر رہی ہوں‘ ورنہ استثناءات تو ہر جگہ ہیں۔ لیکن بقول شاعر مشرق ؎

خال خال اس قوم میں اب تک نظر آتے ہیں وہ
کرتے ہیں اشک سحر گاہی سے جو ظالم وضو!

ٹھیک ہے اسلام عورت کو گھر سے باہر نکلنے سے نہیں روکتا' لیکن اسے اپنے اسلامی یونیفارم کے ساتھ ہی نظر آنا ضروری ہے۔ جب بیجنگ پلس کانفرنس ہوئی تھی تو والد محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحبؒ فرماتے تھے کہ اب مغرب ہمارے خاندانی نظام کی جڑیں کھوکھلی کرے گا اور آج یہ بات صد فیصد درست ثابت ہو رہی ہے کہ عورت کی آزادی کی کوئی حدود نہیں ہیں۔ غور کریں تو معلوم ہوگا کہ مرد کے دست اختیار کو عورتوں کے ضمن میں باندھ دیا گیا ہے۔ اس کی بدترین مثال اسلام آباد میں عورتوں کے مظاہرے کی ہے۔ ان کی اپنی مادر پدر آزادی کے ساتھ ساتھ ان کے بینرز پر لکھی ان کی بے لگام خواہشات ان کی 'بدن بولی' (body language) سے نظر آ رہی تھیں۔ پتہ نہیں وہ کس ایجنسی کے ہاتھوں کھلونا بنی ہوئی ہیں۔ ابھی مستقبل قریب میں بھی فی الحال ہم اس سیلاب کے آگے کوئی بند نہیں باندھ سکتے' اس لیے کہ دجالی دور کے عروج پر اسلام اور مسلمانوں کو تباہ کرنے کا یہودی مشن عورت ہی کو ہتھیار بنا کر پورا کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ ان کے اپنے ہاں عورتوں کے ساتھ جو کچھ بھی ہوتا رہے' لیکن پاکستان میں ذرا سی حرکت پر ملالہ اور مختاراں مائی جیسی عورتوں کو سہارا بنا کر مسلمان عورتوں کو ہر قسم کی بندش سے آزاد کروایا جا رہا ہے۔ (اعاذنا اللّٰہ من ذٰلک)

اس وقت تو آزادیٔ نسواں کی شکل میں ہر طرف صرف ایک مقصد نظر آ رہا ہے اور وہ ہے عورت کی تذلیل اور بے حرمتی۔ اگرچہ یہ 'مائلات' اور 'مُمیلات' والا معاملہ ہے کہ خود عورت بھی یہی چاہتی ہے کہ اس کی تعریف کی جائے۔ کوئی شریف مرد اگر اپنی نظروں کی حفاظت کرتے ہوئے خواتین کی طرف دیکھنے سے رکتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ مولوی ہے' تنگ نظر ہے' دیکھتا ہی نہیں' وغیرہ وغیرہ۔

پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا کے علاوہ اگر خود عورت سے ہی اُس کا مقام دریافت کیا جائے تو وہ ہمیشہ یہی کہتی ہے کہ وہ ہر مقام پر مظلوم ہے (الا ماشاء اللہ)۔ بیٹی' بہن' بیوی' ماں غرض ہر جگہ اپنا حق نہ صرف وصول کر کے بلکہ ضرورت سے زیادہ لے کر بھی وہ اپنے آپ کو مظلوم ہی سمجھتی ہے۔ ع ''ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے'' کے مصداق خواہشات اگر پوری ہوتی نظر نہ آئیں تو شکوے شکایات' بدگمانیاں اور ناشکریاں حواسوں پر چھا جاتی ہیں

اور اپنے گھروں میں گھٹن کا احساس ہونے لگتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عورتوں کا نہ مَن بھرتا ہے اور نہ ظن بدلتا ہے۔ ہم پر یہ بات بھول جانے کا دباؤ ہے کہ ہماری نوجوان بچیاں گھروں میں بٹھائی جا سکتی ہیں یا ان کو چادر اوڑھائی جا سکتی ہے' کیونکہ خود عورت ہی اپنی پہچان کھو چکی ہے' اپنی شناخت بھول چکی ہے۔ وہ صرف اور صرف اپنی نمائش اور مَردوں کی توجہ چاہتی ہے' خواہ جوتے اور پالش کی ڈبیا کے ساتھ ہو یا گاڑی کے پہیے اور پٹرول کے ساتھ ہو۔ بازاروں' دکانوں' کارخانوں' ہوٹلوں' فضاؤں' پارکوں میں ہر جگہ عورت آزادی کے نام پر بے لگام ہو کر پھر رہی ہے۔ لیکن المیہ یہ ہے کہ ان تمام مقامات پر عورت کو کھلی آزادی دے دی گئی اور انسانوں کے بنائے ہوئے نظام کے مطابق عورت کو کھلا چھوڑ دیا گیا اور اس دوران اگر وہ کسی مرد کی ہوس کا نشانہ بن جاتی ہے تو نئے سرے سے مظلوم بن جاتی ہے۔ آج عورت میڈیا میں ایسی ہی مظلومیت کا عنوان بن چکی ہے۔ یہ ایک ایسی دلفریب چھچھوندر ہے کہ ''نہ اُگلے نہ بنے نہ نگلے بنے۔''

پس چہ باید کرد

آخر ہمیں بھی تو کچھ کرنا ہے کہ ہم اپنی خواتین اور بچیوں کو محفوظ بنا سکیں اور ان کو مہذب تعلیم یافتہ خواتین بنا سکیں۔ اس مسئلے کا سب سے پہلا حل تو ہمارے پیارے نبی حضرت محمد ﷺ نے ہمیں دے دیا' جس کا مفہوم ہے کہ ''عورت ٹیڑھی پسلی سے پیدا کی گئی ہے' اُسے سیدھا کرنے کی کوشش کرو گے تو ٹوٹ جائے گی' لہٰذا ان کے حق میں میری طرف سے نرمی کی وصیت قبول کرو''۔ یعنی اس کا حل نہ سختی' نہ مار پیٹ' بلکہ عفو و درگزر' تحمل' نرمی اور خوش اخلاقی ہے۔ علامہ اقبال نے یہ تو بجا فرما دیا کہ ''نسوانیتِ زن کا نگہباں ہے فقط مرد''—— لیکن اس کے برعکس عورت کو مادر پدر آزاد کرنے میں بھی مرد کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ مرد عورت کا قوام' نگران اور ذمہ دار ہے' لیکن گھروں میں اہل خانہ کی اخلاقی تربیت کا کوئی خیال نہیں رکھا جاتا۔ اس کی تخلیق میں اللہ ربّ العزت نے یہ وصف رکھا ہے کہ پیار' محبت' عفو و درگزر' تحمل اور سمجھ داری سے اپنے اہل خانہ کو دین کے راستے پر لے کر چلے اور یہ مرد کی ذمہ داری بھی ہے۔ عام حالات میں تو نبی مکرم حضرت محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے عورت کے ساتھ نرمی اختیار کرنے کا کہا ہے۔ مندرجہ بالا حدیث مبارکہ کے علاوہ ایک مقام پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''یہ آبگینے ہیں' انہیں آہستہ لے کر چلو''۔ اہل خانہ خصوصاً خواتین کی صحیح تربیت کے لیے مندرجہ بالا اوصاف

پیدا کرنے کے لیے مرد اگر آگے نہیں بڑھیں گے تو گھر تباہ و برباد ہو جائیں گے‘ لہٰذا بے جا سختی اور بے جا نرمی دونوں عوامل انتہائی نقصان دہ ہیں۔ قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اَوَمَنْ یُّنَشَّؤُا فِی الْحِلْیَةِ وَهُوَ فِی الْخِصَامِ غَیْرُ مُبِیْنٍ ﴿۱۸﴾﴾ (الزخرف)

’’بھلا وہ جو زیورات میں پلی بڑھی ہو اور جھگڑے کے وقت بھی کوئی واضح دلائل نہ دے سکتی ہو!‘‘

اگرچہ خواتین کے بارے میں قرآن و حدیث کی روشنی ہی میں اس کے برعکس دلائل بھی دیے جا سکتے ہیں اور وہ کسی اور موقع پر رکھ لیتے ہیں‘ لیکن فی الوقت اس پریشانی کا علاج ڈھونڈنا ہے کہ نوجوان نسل خصوصاً نوجوان لڑکیوں اور خواتین کے ساتھ کیسا طرزِ عمل اختیار کر کے ان کی تربیت کی جائے کہ ان کو فحاشی کے گڑھوں اور صراط الجحیم میں گرنے سے بچایا جا سکے۔ چنانچہ مندرجہ بالا اوصافِ حمیدہ کو اپنا کر ہی ہمارے مرد اپنی بہنوں‘ بیٹیوں‘ بیویوں اور ماؤں اور دوسری محرم خواتین کو بھی ایک ٹریک (راستہ) فراہم کر سکتے ہیں۔ جیسے سورۃ الاحزاب میں ’حجاب‘ کا حکم پہلے مردوں کو دیا گیا‘ بالکل اسی طرح اس دور میں مردوں کو آگے بڑھنا ہو گا‘ کیونکہ انہوں نے ہی بڑی مہارت سے ان خوبصورت رشتوں کو ’چراغِ خانہ‘ کی بجائے ’شمع محفل‘ بنایا ہے۔ دوسرے لفظوں میں عورت کو ذلت کی پستیوں اور قعرِ مذلت کے جدید گڑھوں میں مرد نے ہی دھکیلا ہے۔ عورت کی سرشت میں بھی چونکہ بننا سنورنا شامل ہے لہٰذا اب وہ out of control ہو چکی ہے اور اب مَردوں کے بھی سنبھالے نہیں سنبھل رہی۔ چنانچہ ہر مرد کو چاہیے کہ اپنے گھروں میں خصوصاً از حد توجہ دیں اور اپنے اہل خانہ کو سیدھے راستے پر لانے کے لیے پیار‘ محبت اور نرمی کے ہتھیار کو استعمال کریں۔

عام طور پر ہر مرد نے اپنی بیوی کو یہ کہتے سنا ہو گا کہ عورت تو بس پیار کی بھوکی ہوتی ہے اور وہ ہمدردی کے دو لفظوں سے ہی مائل ہو جاتی ہے‘ تو مردوں کو یہ دو بول عورت کے ہر رشتے بیوی‘ ماں‘ بہن‘ بیٹی اور مزید رشتہ دار محرم خواتین کو گھروں میں بٹھانے کے لیے یا ان کو گناہوں سے خصوصاً بے حیائی سے بچانے کے لیے زیادہ سے زیادہ استعمال کرنے چاہئیں۔ مَردوں نے جب عورتوں کو اپنے کاروبار چمکانے کے لیے باہر نکالا تو عورت کی انہی کمزوریوں کا سہارا لیا۔ عورتیں عورتوں کو نہ تو سیدھی اور بے لوث نصیحت زیادہ کر سکتی ہیں اور نہ ہی ایک دوسرے کی

باتوں کو مانتی ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ’’وجود ِزن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ‘‘ کا راگ بھی علامہ اقبال نے ہی الاپا تھا اور عورت کی بے راہروی کا علاج بھی انہوں نے ہی بتایا کہ نسوانیت کی عزت و آبرو کی حفاظت بھی مرد ہی کر سکتا ہے۔

اس وقت یہ تو پورے وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ عورت کی بے حرمتی کے جرم میں کون سا طبقہ زیادہ سرگرمِ عمل ہے‘ لیکن یہ حقیقت ہے کہ بھوک اور افلاس سے بے حال لوگوں سے لے کر ایوانِ بالا کے معززین تک سب اس کام میں مصروف ہیں۔ پاکستان جب اسلامی خلافت کا نمونہ بنے گا اور ایسے جرائم کی قرار واقعی سزا دی جائے گی تو یقیناً ایسے گھناؤنے جرائم کا خاتمہ ہو گا‘ لیکن فی الحال ایسا کوئی مردِ حق نظر نہیں آتا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ایسے حکمران عطا فرمائیں جو ظلم‘ کرپشن‘ خواتین کی آبروریزی اور بقیہ تمام جرائم کا سدباب کر کے وطن عزیز میں اسلام کا عادلانہ نظام قائم کر سکیں۔ لیکن اس سے پہلے ہمیں اپنے حصے کا کام لازمی کرنا ہے کہ گھروں میں خواتین کو احسن طریقے سے سنبھالیں‘ ان کی تربیت کریں‘ اپنا اور ان کا اخلاق سنواریں‘ بچیوں کو شروع سے ہی باحیا رہنا سکھائیں‘ ان کو ساتر لباس پہنائیں‘ مخلوط محفلوں سے بچائیں اور ان کی نگرانی کریں۔ ان کے ساتھ گھروں میں وقت گزاریں‘ باتیں کریں‘ تاکہ وہ باہر کا راستہ نہ ڈھونڈیں۔ انہیں محبت اور شفقت دیں تاکہ وہ غیر مردوں کی خوشنما باتوں کے پھندے میں نہ آئیں۔

ہمارے پیارے نبی حضرت محمد ﷺ نے خواتین کی دنیوی تعلیم و تربیت کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری بھی مرد پر لگائی تھی‘ چنانچہ مردوں کو اپنی اس ذمہ داری کو لازماً محسوس کرنا چاہیے۔ جب تک ہم ایک دوسرے پر عورتوں کے حقوق و تربیت کے ضمن میں الزامات عائد کرتے رہیں گے اور اپنی اپنی ذمہ داریوں سے انحراف کرتے رہیں گے ایسے واقعات ہمارے گھروں میں (یعنی مسلمان گھرانوں میں) کم ہونے کی بجائے بڑھتے چلے جائیں گے۔ ہر سال ’مدر ڈے‘ اور ’خواتین کا عالمی دن‘ جیسے عنوانات سے دن منائے جاتے ہیں‘ لیکن ان میں شیطنت کی تشہیر کے علاوہ کچھ نہیں ہو پاتا‘ کیونکہ اپنی غلطی تسلیم کرنے‘ اپنی اصلاح کرنے اور عورت کے ہر رشتے کو بھرپور تحفظ دینے میں نہ تو مرد سنجیدہ ہیں اور نہ ہی خواتین کے اندر اتنی عقل ہے کہ وہ خود کو بھی اور اپنی بچیوں کو بھی زمانے کی بُری نظروں سے بچانے کا اہتمام کریں۔

(باقی صفحہ 97 پر)

شیطانی جال میں پھنسی انسانیت

شہباز رشید بہورو ☆

پوری دنیا ایک عظیم سانحہ سے دوچار ہے۔ یہ سانحہ انسانیت جیسی صفتِ عالیہ سے انسان کے دستبردار ہونے کی صورت میں پیش آرہا ہے۔ پوری دنیا میں شیاطین الانس والجن نے خباثتوں کا وہ جال بچھایا ہے کہ جس میں انسانی زندگی کے ہر شعبہ سے منسلک افراد پھنس چکے ہیں۔ دانشور، سیاستدان، قانون دان، سائنسدان، تاجر حتیٰ کہ مذہبی رہنما تک سب شیطان کی فریبی مکاریوں کے میزبانِ خاص ہی نہیں، مہربانِ خاص بھی بن چکے ہیں۔ دنیا کے تمام لوگوں کا مشترکہ اثاثہ وصفِ انسانیت، جس کی بنیاد پر انسان اشرف المخلوقات کہلانے کا حق دار ہے، انسانوں کے ہاتھوں ہی پامال ہوتا ہوا نظر آرہا ہے۔ دورِ جدید میں ابلیسی نظام کے سفیروں نے پہلے پہل پوری دنیا میں فکری خباثتوں کے خطوط بڑی جانفشانی کے ساتھ پھیلائے۔ دنیا کے لگ بھگ ہر خطہ میں، خصوصاً مشرقی وافریقی دنیا میں، وہاں کے باشندوں کے روایتی فکری وعملی نظام میں ہر ممکن دخل اندازی کر کے انتہائی حد تک اس میں تغیر برپا کیا۔ بقولِ علامہ اقبال ع

طبع مشرق کے لیے موزوں یہی افیون تھی!

اس فکری وعملی دخل اندازی کے نتیجے میں وہاں کے عوام کا اجتماعی مزاج ہی بدل گیا اور وہ فکری وعملی غلام بننے کے ساتھ ساتھ برائی کے عَلَم بردار بھی بن گئے۔ انسانیت کی صفت سے انسان کو عاری کرنے کے لیے سب سے پہلے کارکنانِ ابلیس نے انسانوں کی حساسیت کو ختم کر دیا۔ حساسیت سے عاری انسان کے لیے بُرائی اس کی خلافِ فطرت وضمیر کسی شے کا وجود نہیں رکھتی۔ یہی وجہ ہے کہ انسانوں کی اکثریت فطرت وعدل کے مخالف اعمال کی عامل بن چکی ہے۔ آج کے انسان کے لیے جھوٹ، وعدہ خلافی، دھوکہ دہی، بے شرمی، عریانیت، بدکاری جیسے بداعمال جرم وگناہ کی حیثیت نہیں رکھتے بلکہ ہنر وفن کا درجہ رکھتے ہیں اور انفرادی اخلاقی

☆ ڈوڈہ، مقبوضہ جموں وکشمیر shahbazrashid.470@gmail.com

جرائم میں ملوث انسانیت کسی بھی اجتماعی جرم کا سدِباب نہیں کرسکتی۔ اگرچہ یہ حقیقت تسلیم کرنی پڑے گی کہ آج نوعِ انسانی کی اکثریت انسانیت پر ڈھائے جانے والے مظالم کے خلاف اپنے ضمیرانہ ردعمل کا شدید احساس اپنے وجود کے اندر پاتی ہے، لیکن اس سے بڑی حقیقت یہ ہے کہ یہی اکثریت بنیادی انسانی اخلاق سے ہاتھ دھوبیٹھی ہے۔

یہی اکثریت شیطانی وسوسوں کی بنیاد پر ابھرنے والی ہر ایک خواہش کو پورا کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگاتی ہے۔ یہی لوگ ہیں جو دنیا میں اپنے حُکّام سے سیکس فری معاشرے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جو ناجائز منافع خوری میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جو انفرادی بداخلاقی میں انتہا کو پہنچ چکے ہوتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جو والدین کے نافرمان ہیں۔ یہی لوگ ہیں جو حرص وطمع کے پیروکار ہیں۔ یہی لوگ ہیں جو تکبّر واستکبار کے لباس میں ملبوس ہو کر اپنے سے کم تر پر زیادتیاں کرنے لگتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جو شہوت پرستی اور دیگر بے شمار صفاتِ رذیلہ کے حامل ہو چکے ہیں۔ ایسے عوام کا کسی بھی اجتماعی ظلم وزیادتی کے خلاف سراپا احتجاج ہونا حقیقی معنوں میں کوئی خاص اثر نہیں رکھتا۔ انفرادی سطح پر یہ عوام مظلوم انسانیت کا درد رکھنے کا دعویٰ تو کرتے ہیں، لیکن اپنی روح پر خود اپنی طرف سے ڈھائے جانے والے ظلم کا انہیں کوئی احساس نہیں ہوتا۔

انسانی دنیا کے اس اخلاقی تناظر میں عوامی احتجاج صرف ایک کوئل کی آواز اور مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کی آوازوں سے اگرچہ حرکتِ التفات دیکھی جاسکتی ہے لیکن کوئی قافلہ اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہو کر رکتا نہیں۔ انسانیت کے دشمن شیاطین الانس والجن کا مطمحِ نظر یہی ہے کہ وہ بحر وبر میں فساد برپا کریں۔ ان کے اس فساد کی بھیانک صورت جو قتل وغارت گری کی شکل میں نمودار ہوتی ہے، فساد کی جزئیات سے چمٹے ہوئے عوام کبھی بھی روک نہیں سکتے۔ مجرمِ اعظم مغرب اور اس کے حواریوں نے قتل وغارت کا جو طوفان کمزور، منتشر، منقسم اور مضمحل مسلمان عوام پر افغانستان، عراق، شام، سوڈان، لیبیا پر برپا کیا وہ پوری انسانی تاریخ میں سیاہ باب کی حیثیت رکھتا ہے۔ منافق مغرب نے نئے طرز پر دورِ جدید میں انسانیت کو مجروح کرنے والے سارے اسباب مع ہتھیار تیار کیے، پھر بڑی عیاری کے ساتھ ان سے جی بھر کے کام لیا۔

نائن الیون کا حادثہ خود کرا کے مسلم دنیا پر دہشت گردی کا لیبل چسپاں کیا۔ اس سے پہلے مسلم دنیا کے سینے میں اسرائیل کا خنجر گھونپ کر مسلم دنیا کا گویا ایک قوی بازو ہی کاٹ دیا۔ ان تمام شطرنجی چالوں کے ذریعے مغرب نے اپنے تاریخی تعصب کی آگ میں جل کر اپنے آپ کو سیاہ کر دیا۔ اس کے سامنے انسانیت کی کوئی قدر و قیمت نہیں‘ اخلاقی قدروں کی کوئی اہمیت نہیں۔ حد تو یہ ہے کہ یہی لوگ آج عالمی امن کے ٹھیکیدار بنے ہوئے ہیں‘ دنیا کو عالمی امن کے قیام کے لیے صرف زبانی مشورے دیا کرتے ہیں اور عالمی بدامنی کے لیے عالمی بدمعاش ریاستوں کو ہر قسم کے لاجسٹک تعاون کے ساتھ ساتھ ہتھیار و اسلحہ بھی مہیا کرتے ہیں۔

’’پس چہ باید کرد‘‘ کے مطابق اُمت مسلمہ کو اس بحران سے نکلنے کے لیے اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے چمٹنا چاہیے۔ دلوں میں لگی ’’وہن‘‘ کی بیماری سے نجات پانے کا واحد حل یہی ہے۔ لیکن اپنے بچوں کو صبح جاگتے اور رات کو سونے سے پہلے خالص دنیا کا درس دینے والی اُمت ایک ایسی نسل (generation) دنیا کے حوالے کر رہی ہے جن کے رگ و پے میں دینار و درہم کی محبت سرایت کر گئی ہے‘ غیرت و حمیت کے بجائے بے غیرتی کا مادہ لیے ہوئے اقوامِ عالَم کے سامنے ذلت و مسکنت کی تصویر پیش کر رہی ہے۔

اُمتِ مسلمہ پر ڈھائے جانے والے مظالم پر مسلم حکمرانوں کی پراسرار خاموشی ان کے اندر ایک لاعلاج بیماری کی عکاسی کرتی ہے‘ جو حدیث نبوی ﷺ کے مطابق ’’وہن‘‘ کی بیماری ہے‘ یعنی دنیا کی محبت اور موت سے کراہت۔ اس وہن کی بیماری سے جب تک اُمتِ مسلمہ چھٹکارا نہیں پاتی تب تک اسلام دشمن قوتیں آگ اور خون کا کھیل اپنی مرضی سے کبھی عالَمِ اسلام کے ایک حصے میں‘ کبھی دوسرے میں کھیلتی رہیں گی اور ہم خاموش تماشائی اور سستی و کاہلی کا مجسمہ بے جان بنے بیٹھے رہیں گے۔

برما میں مظلوم انسانوں کی آہیں نہ صرف اُمتِ مسلمہ کی غیرتِ ایمانی کو پکار رہی ہیں‘ بلکہ پوری دنیا کے عوام سے سراپا درخواست گزار ہیں کہ آؤ اپنی نوع کی حفاظت کرو‘ اپنے انسان ہونے کے تقاضوں کو پورا کرو‘ آؤ شرفِ انسانیت کے اعزاز کو بحال کرو‘ اپنی ماؤں بہنوں کی عصمتوں کی حفاظت کرو۔ لیکن یہ صدائیں پوری دنیا کے لوگوں کی عصبیت‘ تنگ نظری‘ قوم پرستی اور ہٹ دھرمی کی دیواروں کے ساتھ ٹکرا کر واپس آ جاتی ہیں۔ ابلیس خوش ہے کہ آدمیت

حیوانیت میں تبدیل ہو رہی ہے‘ رحم دلی سخت دلی میں تبدیل ہو رہی ہے‘ عظمتِ انسانیت پامال ہو رہی ہے‘ اور اس سے بڑھ کر اس کی خوشی اس پر ہے کہ یہ دنیا امن گاہ کے بدلے فساد گاہ میں تبدیل ہو رہی ہے۔ اگر دنیا کے حکمران مشرقِ وسطیٰ اور برما میں جاری ظلم و تشدد کو روکنے کے لیے کوئی سنجیدہ اقدام نہیں اٹھاتے تو بعید نہیں کہ آسمان سے پتھروں کی بارش ہو اور زمین کی تھرتھراہٹ دنیا کی اچھی خبر لے۔ قرآنِ مجید میں آیا ہے:

﴿ءَاَمِنْتُمْ مَّنْ فِی السَّمَآءِ اَنْ یَّخْسِفَ بِکُمُ الْاَرْضَ فَاِذَا ہِیَ تَمُوْرُ ﴿۱۶﴾ اَمْ اَمِنْتُمْ مَّنْ فِی السَّمَآءِ اَنْ یُّرْسِلَ عَلَیْکُمْ حَاصِبًا ؕ فَسَتَعْلَمُوْنَ کَیْفَ نَذِیْرِ ﴿۱۷﴾﴾ (الملک)

’’کیا تم نڈر ہو گئے اس سے جو آسمان میں ہے کہ وہ دھنسا دے تم کو زمین میں‘ پھر تبھی وہ لرزنے لگے۔ یا نڈر ہو گئے ہو اس سے جو آسمان میں ہے کہ وہ برسا دے تم پر مینہ پتھروں کا۔ سو تم عنقریب جان لو گے کیسا ہے میرا ڈرانا!‘‘

دنیا کے حکمرانوں نے کیا یہ سمجھ رکھا ہے کہ مظلوموں کی آہ و بکا کو سننے والا کوئی نہیں؟ نہیں نہیں‘ ان مظلوموں کا مالک و خالق ضرور ان دشمنانِ انسانیت کو عذابِ الیم کی لپیٹ میں لے گا۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اللہ کے نبی ﷺ کا فرمانِ مبارک نقل کرتے ہیں:

((اِتَّقِ دَعْوَةَ الْمَظْلُوْمِ، فَاِنَّهَا لَیْسَ بَیْنَهَا وَبَیْنَ اللّٰهِ حِجَابٌ)) (متفق علیه)

’’مظلوم کی بددعا سے بچو‘ کہ اس کے اور اللہ کے درمیان کوئی حجاب نہیں ہوتا۔‘‘ ❀❀

شرک کی حقیقت، اقسام اور دورِ حاضر کے شرک سے واقفیت کے لیے مطالعہ کیجیے

حقیقت و اقسامِ شرک

ڈاکٹر اسرار احمد

اشاعت خاص 100 روپے، اشاعت عام 60 روپے

اصلی اور فرعی مسائل میں مخالفین کے ساتھ برتاؤ کرنے کے فقہی ضابطے (۴)

تالیف: ڈاکٹر احمد بن سعد الغامدیؒ (م ۱۴۳۴ھ)

ترجمہ: ڈاکٹر صہیب حسن ☆

ضابطہ نمبر ۱۰:

مسلمانوں کی عزت و وقار کا خیال رکھنا

کتاب، سنت اور اجماعِ امت سے ایک مسلمان کی عزت داغدار کرنے کو حرام قرار دیا گیا ہے، اس لیے چاہے ادنیٰ سا شبہ ہو یا معمولی سا اختلاف ہو، پھر بھی کسی پر زیادتی کرنے سے گریز کرنا چاہیے۔ قرآن کریم میں ایک مسلمان کے خون، عزت اور مال کو حرام قرار دیا گیا ہے، اور جہاں کہیں بھی ایک مسلمان کو تکلیف پہنچتی ہو وہاں پوری طرح چھان بین کرنے کا حکم دیا گیا ہے، نہ صرف مسلمان بلکہ غیر مسلم کے بارے میں بھی کہ جس پر جرم ثابت نہ ہوا ہو۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا اَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًۢا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰي مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِيْنَ ۝۶﴾ (الحجرات)

''اے ایمان والو! اگر ایک فاسق شخص کوئی خبر لے کر آئے تو اس کی چھان بین کر لو

☆ سیکریٹری، اسلامک شریعہ کونسل، لندن (برطانیہ)

کہیں ایسا نہ ہو کہ تم لاعلمی میں کسی قوم پر حملہ کر بیٹھو اور پھر اپنے کیے پر نادم ہو۔''

اس آیت کے مطابق اللہ تعالیٰ نے ان خبروں کے بارے میں تحقیق کا حکم دیا ہے جو دوسروں کے حقوق سے متعلق ہیں تاکہ ایک جھوٹی خبر کی بنا پر اس شخص کو تکلیف نہ پہنچے جس کی طرف خبر منسوب ہے اور پھر جب حقیقت کھل جائے تو انسان نادم ہو، اور ایسی ندامت سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں پر مسلمان یا غیر مسلم کے حق کی تحدید نہیں کی ہے۔ صرف ''قوم'' کا لفظ ارشاد فرمایا جس سے مسلم، غیر مسلم سب مراد ہو سکتے ہیں، اور پھر خاص طور پر ایک مسلمان کو ایذا پہنچانے یا اس پر طعنہ زنی سے خبردار کیا ہے۔ ارشاد فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ ۚ وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ۭ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ ۚ وَمَنْ لَّمْ يَتُبْ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝۱۱ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ۡ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ۭ اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِيْمٌ ۝۱۲﴾ (الحجرات)

''اے ایمان والو! مرد دوسرے مَردوں کا مذاق نہ اڑائیں، ممکن ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں، اور نہ عورتیں عورتوں کا مذاق اڑائیں، ممکن ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں، اور آپس میں ایک دوسرے پر عیب نہ لگاؤ اور نہ کسی کو بُرے القاب سے یاد کرو، ایمان کے بعد فسق برا نام ہے، اور جو توبہ نہ کریں وہی ظالم لوگ ہیں۔ اے ایمان والو! بہت بدگمانیوں سے بچو، یقین مانو کہ بعض بدگمانیاں گناہ ہیں، اور بھید نہ ٹٹولا کرو اور نہ تم میں سے کوئی کسی کی غیبت کرے، کیا تم میں سے کوئی بھی اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانا پسند کرتا ہے؟ پھر تم کو اس سے گھن آئے گی، اور اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ توبہ قبول کرنے والا، مہربان ہے۔''

اے میرے برادر مسلم! ملاحظہ فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ نے ایک مسلمان کی عزت کو ان احکامات کے طفیل ایک چار دیواری مہیا کر دی ہے۔ اہلِ ایمان کو وصف ایمان (يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا) سے خطاب فرمایا ہے تاکہ اللہ سبحانہ کے اوامر اور نواہی کی اہمیت کو اجاگر کیا جا سکے۔

بے شمار احادیث میں یہی بات بیان ہوئی ہے، میں ان میں سے صرف دو حدیثوں کا تذکرہ

کرتا ہوں۔ پہلی حدیث جس کے راوی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((لَا تَحَاسَدُوْا، وَلَا تَنَاجَشُوْا، وَلَا تَبَاغَضُوْا، وَلَا تَدَابَرُوْا، وَلَا يَبِعْ بَعْضُكُمْ عَلٰى بَيْعِ بَعْضٍ، وَكُوْنُوْا عِبَادَ اللّٰهِ اِخْوَانًا، اَلْمُسْلِمُ اَخُو الْمُسْلِمِ، لَا يَظْلِمُهٗ، وَلَا يَخْذُلُهٗ، وَلَا يَحْقِرُهٗ، اَلتَّقْوٰى هَاهُنَا ۔ وَيُشِيْرُ اِلٰى صَدْرِهٖ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ ۔ بِحَسْبِ امْرِئٍ مِنَ الشَّرِّ اَنْ يَحْقِرَ اَخَاهُ الْمُسْلِمَ، كُلُّ الْمُسْلِمِ عَلَى الْمُسْلِمِ حَرَامٌ :دَمُهٗ وَمَالُهٗ وَعِرْضُهٗ))(۱)

''نہ حسد کرو، نہ ہی اپنے ساتھی کی بولی پر زائد بولی دو، نہ ہی ایک دوسرے سے بغض رکھو، نہ ہی پیٹھ پیچھے ایک دوسرے کی برائی کرو، ایک شخص اگر کوئی بیع کر رہا ہے تو اس میں دخل اندازی نہ کرو، اللہ کے بندے اور بھائی بھائی بن کر رہو۔ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے، جو نہ اس پر ظلم کرتا ہے، نہ اسے رسوا کرتا ہے، نہ اسے حقیر سمجھتا ہے، اور پھر اپنے سینے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تین مرتبہ فرمایا: تقویٰ یہاں ہے۔ ایک آدمی کے برا ہونے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر سمجھے۔ ہر مسلمان کے لیے دوسرے مسلمان کا خون، آبرو اور مال حرام ہے۔''(۱)

حجۃ الوداع کے موقع پر زمان و مکان کے اعتبار سے عظیم ترین موقف میں اللہ کے نبی ﷺ نے اپنے خطبے میں ارشاد فرمایا: ''لوگو! یہ کون سا مہینہ ہے؟'' صحابہؓ نے کہا: ''اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں''۔ فرمایا: ''کیا یہ ذوالحجہ کا مہینہ نہیں؟'' انہوں نے کہا: ''بے شک''۔ پھر پوچھا: ''یہ کون سا شہر ہے؟'' کہا کہ اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں''۔ فرمایا: ''کیا یہ بلد حرام نہیں؟'' کہا: ''بے شک''۔ پھر پوچھا: ''بتاؤ یہ کون سا دن ہے؟'' کہا: ''اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں''۔ فرمایا: ''کیا یہ قربانی کا دن نہیں؟'' کہا: ''بے شک''۔ پھر فرمایا: ''تو تمہارے خون، تمہاری آبرو اور تمہارے مال تم پر ایسے حرام ہیں جیسے آج کے دن کی حرمت، تمہارے اس شہر میں اور تمہارے اس ماہ میں۔''(۲)

اور نبی محترم ﷺ جب صحابہ کرامؓ سے کوئی سوال کرتے تو وہ طویل خاموشی اختیار کرتے، ایسا معلوم ہوتا کہ اب جو سوال آپؐ نے پوچھا ہے، اس کا جواب وہ کسی اور نام سے دیں گے۔ پھر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ادب کو دیکھیں کہ باوجود یکہ انہیں جواب معلوم ہے وہ علم کو اللہ اور اُس کے رسول کی طرف لوٹاتے ہیں، اور یہ نبی ﷺ کے سامنے ادب کا ایک اونچا مقام ہے۔ اور اس

حدیث سے اس بات کی تاکید ہوگئی کہ سب سے بہتر وقت میں اور سب سے اعلیٰ جگہ پر ایک مسلمان کے خون، مال اور آبرو کی حرمت پر مہر لگا دی گئی۔

شیخ الاسلام کہتے ہیں: ''اصل یہی ہے کہ مسلمانوں کے مال، خون اور آبرو ایک دوسرے پر حرام قرار دے دیے گئے ہیں، سوائے اللہ اور اس کے رسول کی اجازت کے وہ حلال نہیں ہو سکتے۔''

ابن تیمیہ کہتے ہیں: ''جو لوگ اس جنس فعل کو حرام سمجھتے ہیں وہ تاویل کرنے والوں کی تھوڑی سی مذمت کر کے زیادتی کرتے ہیں، جو بہر حال قلیل ہونے کی بنا پر قابل معافی ہے، لیکن ان کے پیروکار مذمت کا دائرہ اتنا بڑھا دیتے ہیں کہ جس سے وہ اپنے بھائیوں کی آبرو اور غیر آبرو کو حلال قرار دے دیتے ہیں کہ جسے اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے حرام قرار دیا ہے۔''(۳)

شوکانی اپنی کتاب ''رفع الریبہ'' میں لکھتے ہیں:

''جان لو کہ غیبت کا حرام ہونا کتاب، سنت اور اجماع سے ثابت ہے اور اس بارے میں جو ارشادات کتاب و سنت میں بیان ہوئے ہیں وہ عمومی نوعیت کے ہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کے کسی بھی فرد کے لیے کسی بھی دوسرے فرد کی غیبت جائز نہیں ہے۔ کسی بھی موقع پر ایک مسلمان کی غیبت اسی وقت جائز ہوگی جب کہ اس عموم کے مقابلہ میں کوئی خصوصی دلیل اسے جائز قرار دے، اور اگر ایسی دلیل موجود ہو تو سر آنکھوں پر، وگرنہ ایسا کرنا اللہ کے بارے میں وہ کہنا ہے کہ اس نے نہیں کہا اور بغیر کسی دلیل کے اس چیز کو حلال ٹھہرانا ہے جسے اللہ نے حرام قرار نہیں دیا۔''

ابن القیم ارشاد فرماتے ہیں:

''یہ عجب بات ہے کہ آدمی کے لیے اکل حرام، ظلم، زنا، چوری، شُربِ خمر، حرام نظر وغیرہ سے بچنا تو آسان ہوتا ہے لیکن اپنی زبان کو قابو کرنا بڑا مشکل ہو جاتا ہے۔ کتنے ہی آدمیوں کو تم دیکھتے ہو کہ وہ بدکاری اور ظلم سے بچے ہوئے ہیں، لیکن ان کی زبان زندوں اور مردوں کے بارے میں قینچی کی طرح چل رہی ہوتی ہے اور انہیں قطعاً پروا نہیں ہوتی کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔''(۵)

اس لیے اے میرے برادر مسلم! کسی بھی اختلاف اور شبہ کی وجہ سے اللہ کے ٹھہرائے ہوئے حرام کو حلال نہ ٹھہراؤ۔ ایک مسلمان کی آبرو کو محفوظ قرار دے دیا گیا ہے، بغیر کسی قطعی دلیل کے اسے دین سے خارج نہیں قرار دیا جا سکتا۔

دوسری حدیث: نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((لَا يَرْمِي رَجُلٌ رَجُلًا بِالْفُسُوْقِ، وَلَا يَرْمِيْهِ بِالْكُفْرِ، اِلَّا ارْتَدَّتْ عَلَيْهِ، اِنْ لَمْ يَكُنْ صَاحِبُهُ كَذٰلِكَ))(۶)

''کوئی بھی شخص دوسرے کسی شخص کو فسق کا طعنہ نہ دے' اور نہ ہی کفر کا۔ اگر وہ شخص حقیقتاً ایسا نہ ہوا تو یہ کلمہ طعنہ دینے والے کی طرف لوٹ آئے گا۔''

صحیح مسلم کی روایت میں ہے:

((وَمَنْ دَعَا رَجُلًا بِالْكُفْرِ اَوْ قَالَ عَدُوُّ اللّٰهِ وَلَيْسَ كَذٰلِكَ اِلَّا حَارَ عَلَيْهِ))(۷)

''اگر کسی شخص نے کسی دوسرے کو کافر کہا یا اللہ کا دشمن کہا حالانکہ وہ ایسا نہ تھا تو یہ کہنا اس پر پلٹ جائے گا۔''

قرطبی کہتے ہیں: ''حاصل کلام یہ ہوا کہ اگر وہ شخص جسے کافر کہا گیا ہے واقعی شرعاً کفر کا مرتکب ہے تو قائل سچا ہے اور اس کا قول صحیح جگہ پر وارد ہوا ہے' لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو قائل گناہگار ہے بلکہ اس قول کی وجہ سے وہ سزاوار بھی ٹھہرے گا۔''(۸)

ابن حجر کہتے ہیں: ''اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر ایک شخص نے دوسرے سے کہا تم فاسق ہو یا کافر ہو' تو اگر وہ واقعتاً ایسا نہیں ہے تو پھر اس بات کا کہنے والا فاسق یا کافر ٹھہرا' لیکن اگر وہ ایسا ہی تھا تو سچ بولنے کی بنا پر اس پر کوئی وبال نہ ہوگا۔'' (۹)

کسی کو کافر کہنے والے کے پاس دوسرے کے کفر کے بارے میں حقیقی طور پر کچھ ثابت کرنا اتنا آسان نہیں ہوتا' وہ صرف اپنے گمان کے طور پر ایسا کہتا ہے اور ہوسکتا ہے کہ اس کا گمان سچا نہ ہو' اس لیے کسی کو کافر کہنا خطرے سے خالی نہیں اور اگر اس سے بچا جائے تو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہے۔ تو پھر کافر کہنے سے بچنے میں ہی سلامتی ہے۔

حواشی

(۱) صحیح مسلم' نمبر ۶۴۹۳۔
(۲) صحیح البخاری' نمبر ۶۷' صحیح مسلم' ۱۶۷۹' یہ الفاظ صحیح مسلم کے ہیں۔
(۳) الاستقامہ' ۱:۳۰۱۔۳۰۲۔
(۴) رفع الریبۃ' بضمن مجموعۃ الرسائل المنیریۃ' ۱:۵۰۔
(۵) الداء والدواء' ص ۱۸۷۔
(۶) صحیح البخاری' نمبر ۶۰۴۵۔
(۷) صحیح مسلم، نمبر ۶۱۔
(۸) فتح الباری' ۱۰:۴۶۶۔
(۹) ایضاً ۱۰:۴۶۶۔

ضابطہ نمبر ۱۱:

ظاہری افکار کی روشنی میں معاملہ کرنا

مخالف سے مناظرہ کرتے وقت یا اُس پر تنقید کرتے وقت اس کی نیت یا باطن کو نہ چھیڑا جائے' بلکہ جو کچھ وہ ظاہر کرے اسی پر کلام کیا جائے' نیتوں یا قلبی اعمال کو چھیڑنا صحیح نہیں ہے۔ اگر مخالف موافقت کی بات کرے تو چاہے وہ ہمارے گمان کے مطابق اس پر اعتقاد نہ رکھتا ہو' ہمیں اسے قبول کر لینا چاہیے اِلّا یہ کہ اس کے مذہب میں جھوٹ بولنا جائز ہو یا واجب ہو' ایسی صورت میں ہمیں اس کی بات قبول کرنے میں احتیاط کرنی چاہیے — اس لیے کہ دنیوی حد تک اسلام میں لوگوں کے ظاہری افکار کے مطابق معاملہ کیا جاتا ہے' اور جہاں تک ان کے پوشیدہ اعمال کا تعلق ہے تو اللہ عزوجل اس کا حساب کریں گے اور اسی بنیاد پر اللہ کے نبی ﷺ نے منافقوں سے ان کے اعلانِ اسلام کو قبول کر لیا تھا' حالانکہ وہ اگر سب نہیں تو ان میں سے کچھ لوگوں کے نفاق کے بارے میں بخوبی علم رکھتے تھے — اور پھر ان کے ظاہر کے حساب سے اُن سے معاملہ فہمی رکھیں۔

ابن تیمیہ منافقین کے ساتھ نبی مکرم ﷺ کے تعامل کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

''نبی ﷺ کو جب تک منع نہیں کیا گیا وہ ان پر نماز جنازہ بھی پڑھتے رہے اور ان کے لیے مغفرت کی دعا بھی کرتے رہے' منع کیے جانے کا سبب ان کا کفر تھا۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ جس کے بارے میں یہ معلوم نہ ہو کہ وہ باطن میں کافر ہے' اس پر نماز پڑھی جاسکتی ہے' اور اس کے لیے دعائے استغفار کی جاسکتی ہے چاہے وہ بدعت کا یا گناہوں کا مرتکب کیوں نہ ہو۔''

اور پھر وہ فرماتے ہیں:

''مقصود یہ ہے کہ صرف گناہ کے ارتکاب سے یا کسی بدعت کے جاری کرنے سے' اور چاہے وہ اس کا داعی بھی ہو' اسے باطنی طور پر کافر قرار نہیں دیا جاسکتا اِلّا یہ کہ وہ منافق ہو' اور جس شخص کے دل میں اللہ کے رسول ﷺ کی رسالت پر ایمان ہو اور جو شخص دل سے اللہ کے رسول پر اور آپ کی لائی ہوئی تعلیمات پر ایمان رکھتا ہو' لیکن اس کے ساتھ ساتھ بعض بدعتوں کی تاویل بھی کرتا ہو وہ سرے سے کافر نہیں ہے۔ صحابہ میں سے نہ حضرت علیؓ اور نہ

کوئی اور انہیں کافر قرار دیتا تھا' بلکہ وہ انہیں ظالم اور سرکش مسلمان قرار دیتے تھے۔ اور اس بارے میں ہم دوسری جگہ پر آثار و احادیث درج کر چکے ہیں۔''(۱)

اگر ان لوگوں کے بارے میں کہ جنہوں نے مسلمانوں کو کافر قرار دیا اور ان کا خون بہانا جائز سمجھا یہ اعتقاد رکھا جا سکتا ہے تو پھر ان مسلمانوں کے بارے میں بالاولیٰ یہ اعتقاد رکھنا جائز ہوگا کہ جو کسی غلطی یا معصیت کے مرتکب ہوئے ہوں اور خاص طور پر وہ اہل علم میں سے بھی ہوں۔

حاشیہ

(۱) الفتاویٰ الکبریٰ' ۲:۱۱۳۔

❁

ضابطہ نمبر ۱۲:

مخالف کے ساتھ انصاف کرنا واجب ہے

مخالف کے ساتھ انصاف ان چند امور میں ہو سکتا ہے:

(۱) اُس کے علم کا اعتراف کرنا۔

(۲) اس کی صحیح بات کو ماننا۔

(۳) اس کی بات کا وہ مطلب نہ نکالنا جو اس میں نہیں پائی جاتی۔

ایسا انصاف کرنا شریعت کا تقاضا ہے اور یہ مخالف کے لیے حق کو قبول کرنے کی کنجی ہے۔

انصاف کا دامن چھوڑنے کے اسباب کا امام شوکانی نے بہت عمدگی سے ذکر کیا ہے' وہ کہتے ہیں: جان لیجیے کہ دائرۂ انصاف سے نکلنے اور تعصب کی ہلاکتوں میں پڑنے کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں' جن میں سے چند ایک کا تذکرہ ملاحظہ ہو:

(۱) ایک طالب علم ایک خاص مذہبی ماحول میں پلا بڑھا ہو یا کسی خاص عالم سے اس نے استفادہ کیا ہو جس کی بنا پر اس میں تعصب پایا جائے اور انصاف نہ کر سکے' یعنی اس مذہب پر تعصب کا اظہار کرے اور دوسرے کسی کو نہ مانے۔

(۲) مال' عزت و جاہ کی محبت و جہاءِ سلطنت اور اصحابِ اقتدار کی چاپلوسی کرنا اور ان سے امیدیں باندھنا' اور اس بنا پر ان کا خیال رکھنا اور انصاف نہ کرنا۔(۱)

شوکانی کے بقیہ کلام سے پہلے میں یہاں امام ابن القیم اور ایک عیسائی پادری کے مابین مناظرے کا ذکر کرتا چلوں جس سے معلوم ہوگا کہ دنیا کے پجاریوں پر وجاہت اور حصولِ عزت کا بھوت کیسے چھا جاتا ہے:

امام ابن القیم کہتے ہیں: میں نے دن کا اکثر حصہ ایک عیسائی عالم کے ساتھ مناظرہ کرتے گزارا' جب اس پر حق واضح ہو گیا تو وہ مبہوت ہو کر رہ گیا۔ جب ہم دونوں اکیلے تھے تو میں نے اُس سے پوچھا: ''اب تمہیں حق کے اتباع سے کون سی چیز روکتی ہے؟'' تو وہ کہتا ہے: ''جب ہم ان گدھوں کے پاس جاتے ہیں (یہ اس کے الفاظ ہیں) تو وہ میری سواری کے کھروں کے نیچے کپڑے بچھاتے ہیں۔ اپنے اموال اور اپنی عورتوں کے بارے میں میرے فیصلے کو قبول کرتے ہیں' جو کچھ میں کہوں اس کی نافرمانی نہیں کرتے۔ اب نہ میں کوئی ہنر جانتا ہوں' نہ قرآن نہ نحو نہ فقہ' اگر آج مسلمان ہو جاؤں تو بازاروں میں بھیک مانگتا پھروں گا' اور کون ہے جو یہ بات اپنے لیے پسند کرے گا''۔ میں نے کہا: ''ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ تم اللہ سے یہ گمان کیوں رکھتے ہو کہ اگر تم اپنی خواہشات پر اس کی پسند کو ترجیح دو گے تو وہ تمہیں ذلت و رسوائی سے دوچار کرے گا اور تم حاجت مند رہ جاؤ گے؟ —— اور فرض کر لو کہ اگر ایسا ہوا بھی تو جو کچھ تم نے حق کی صورت میں پایا ہے اور یہ کہ تم نارِ جہنم سے بچ گئے ہو اور اللہ کی ناراضگی اور غضب سے بھی محفوظ ہو گئے ہو تو اس میں تمہیں ان چیزوں کا پورا پورا بدلہ مل گیا ہے جو تم سے چھوٹ گئی ہیں''۔ تو کہنے لگا: ''اُس وقت تک جب تک کہ اللہ کا اذن نہ ہو''۔ میں نے کہا: ''تقدیر سے حجت نہیں پکڑی جاتی' اور اگر تقدیر حجت ہوتی تو پھر یہودیوں کے لیے مسیح علیہ السلام کو جھٹلانا حجت بن جاتا اور اسی طرح مشرکین کا رسولوں کو جھٹلانا۔ تم لوگوں کو تو خاص طور پر یہ زیب نہیں دیتا کہ تم لوگ ویسے ہی تقدیر کا انکار کرتے ہو' تو پھر اس سے حجت کیوں پکڑتے ہو؟'' تو کہنے لگا: ''یہ باتیں چھوڑ دو''۔ اور پھر اس نے راہِ فرار اختیار کی۔(۲)

اب ہم شوکانی کی باقی باتوں کی طرف آتے ہیں' وہ فرماتے ہیں:

(۳) اہلِ علم کے ساتھ جھگڑے اور مناظرے کرنا کہ جس سے اپنی خود نمائی اور غلبے پن کی خواہش کا اظہار ہوتا ہے اور اس کے نتیجے میں مخالف کا تعصب مزید گہرا ہو جاتا ہے اور وہ انصاف نہیں کر پاتا ہے۔

(۴) اپنے ہم نوا لوگوں کے مذہب کی طرف میلان رکھنا‘ ان کی تائید میں دلائل کی تلاش میں لگے رہنا کہ جس سے ان کے علم وفضل کی نمائش مقصود ہوتی ہے۔ وہ غلط ہوں تب بھی ان کا ساتھ دینا اور انصاف کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دینا (مراد یہ ہے کہ اپنے سے قریب جماعتوں‘ پارٹیوں اور مذاہب کی حمایت میں لگے رہنا)۔ حق تک پہنچنا مقصد نہیں ہوتا بلکہ ان کی تقویت میں دلائل کا تلاش کرنا مقصود ہوتا ہے۔ حق تو حق ہے‘ چاہے وہ اپنوں کے پاس ہو یا غیروں کے۔

(۵) لوگوں کے ڈر سے اس بات میں حرج محسوس کرنا کہ میں اپنے اس فتویٰ یا قول سے رجوع کرلوں جو لوگوں میں مشتہر ہو چکا ہے لیکن اس کا غلط ہونا بھی ثابت ہو چکا ہے‘ اور پھر وہ صرف اس حرج کی بنا پر اپنے موقف پر قائم رہتا ہے اور انصاف نہیں کرتا۔

(۶) عمر میں اپنے سے چھوٹے اور علم وشہرت میں اپنے سے کم تر فرد کے ساتھ مناظرہ کرتے وقت اگر غلطی ہو جائے تو پھر اس غلطی سے چمٹے رہنا اور انصاف نہ کرنا۔

(۷) ایسے متعیّن قواعد کا لحاظ کرنا جو اس کے لیے مفید ہوں اور مخالف کے لیے غیر مفید حالانکہ وہ خود مسلّمہ قواعد میں سے نہ ہوں‘ اور اس بنا پر تعصّب کی راہ اختیار کرنا اور انصاف نہ کرنا۔

(۸) اپنے مذہب کی کتابوں پر اعتماد کرتے ہوئے اپنے قول پر اڑے رہنا‘ کیونکہ اس طرح اپنے مذہب کی برتری اور مخالف کے مذہب کی کمزوری ظاہر کرنا مقصود ہوگی اور یہ بھی تعصب اور ناانصافی کا باعث ہوگی۔

(۹) جرح وتعدیل کے باب میں متعصب قسم کے مؤلفین کی کتابوں پر انحصار کرنا کہ جن میں اس کے موافق راوی کی تعدیل کی گئی ہو اور مخالف راوی پر جرح کی گئی ہو۔ ایسی کتابوں پر انحصار کرنے سے تعصب اور ناانصافی کا راستہ کھلتا ہے۔

(۱۰) علم وفضل اور قدر ومنزلت میں اگر دو شخص قریب قریب ہوں تو تعصب اور ناانصافی کی بنا پر ایک دوسرے کو غلط ثابت کرنے پر اُتر آتے ہیں۔

(۱۱) رائے پر مبنی علوم جن میں اجتہادی علوم وفنون جیسے اصولِ فقہ کی آمیزش ہوتی ہے‘ پر کُلّی اعتماد کرنا جس کے نتیجے میں رائے پر تعصب اور راہِ انصاف کو چھوڑنے کا داعیہ پیدا ہوتا ہے۔ (۳)

انصاف کے بعض نمونے

چند نمونے ملاحظہ ہوں کہ علماء اپنے مخالفین کے ساتھ کیسے انصاف کیا کرتے تھے:

☆ ابن تیمیہ چند مخالف تالیفات کا ذکر کرتے ہوئے اصحابِ تالیف کے لیے خود ہی عذر تلاش کر لیتے ہیں۔ ارشاد کیا: ’’جیسے رازی کی ’’**المباحث الشرقیہ**‘‘ اور اس جیسی دوسری کتابیں‘ اور پھر متکلمین کے ان دلائل کا ذکر کرتے ہیں کہ جن کے مطابق ایسے حوادث کا ہونا ناممکن ہے جس کی کوئی ابتدا نہ ہو اور یہ کہ زمانے‘ حرکت اور جسم کا ایک آغاز ضروری ہے۔ پھر وہ ان کے دلائل کی تردید کرتے ہیں‘ اپنا جواب دیتے ہیں اور اس کی تائید کرتے ہیں جو یہ کہتا ہے کہ ان کا کوئی آغاز نہیں‘ اور وہ ایسا جان بوجھ کر باطل کو سراہنے کے لیے نہیں کرتے بلکہ وہ وہی کچھ کہتے ہیں جو ان کی بحث وتحقیق کے مطابق عقلی دلائل سے ثابت ہوتا ہے۔ اگر انہیں عقلی دلائل میں کوئی ایسی بات ملے جس سے وہ فلاسفہ کے کلام کی تردید کر سکیں تو وہ ایسا کر گزرتے ہیں‘ کیونکہ ان کا مطمحِ نظر صرف اتنا ہوتا ہے کہ مطلق تحقیق ہونی چاہیے۔ تو جہاں وہ اپنی بات کے مطابق ان کے کلام کی نامعقولیت ثابت کر سکتے ہیں‘ کر دیتے ہیں۔ وہ سبھی کے ساتھ ایسا کرتے ہیں۔ اس بنا پر کچھ لوگ ان سے بدظنی کرتے ہوئے سمجھتے ہیں کہ وہ جان بوجھ کر باطل کی حمایت کر رہے ہیں‘ لیکن ایسا ہرگز نہیں ہے‘ بلکہ وہ ہر مقام پر جو چیز انہیں بحث ونظر اور علم کی روشنی میں صحیح لگتی ہے اسے بیان کر دیتے ہیں۔‘‘ (۴)

ابن تیمیہ رحمہ اللہ یہاں رازی سے عمداً باطل کی حمایت کی نفی کر رہے ہیں اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ وہ ایک محقق ہیں اور اس سے قطع نظر کہ ان کی رائے صحیح ہے یا غلط‘ وہ ان کی تحقیق کے نتیجے کو بیان کرتے ہیں۔ گویا ابن تیمیہ ان کے بارے میں اپنی منصفانہ رائے پیش کر رہے ہیں‘ حالانکہ انہوں نے رازی کے عقائد کے بارے میں ایک عظیم کتاب بعنوان ’’**بیان تلبیس الجھمیہ**‘‘ لکھی ہے جو آخری طبع شدہ نسخے کے مطابق دس جلدوں میں شائع ہوئی ہے اور جس میں وہ رازی کے عقائد اور منہج پر بالتفصیل گفتگو کرتے نظر آتے ہیں۔

☆ ابن تیمیہ ابوبکر باقلانی کے بارے میں ابوحامد اسفرائنی کے موقف کو بیان کرتے ہیں اور باقلانی کے اہل تاویل کے سرخیل ہونے کے باوجود ان کی فضیلت ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

’’لیکن اس کے باوجود میں یہ کہوں گا کہ وہ بڑے فضائل اور محاسن رکھتے ہیں۔ زنادقہ‘

ملحدین اور اہلِ بدعت کی تردید میں پیش پیش ہیں اور ابن کلاب اور اشعری سے نسبت رکھنے والوں میں ان سے بڑھ کر صاحبِ قدر اور صاحبِ تصنیف کوئی اور نہیں ہوا اور انہی کی وجہ سے یہ قول مشہور ہوا۔‘‘(۵)

☆ ذہبی‘ الحاکم کے بارے میں فرماتے ہیں:

’’محمد بن عبداللہ الضبی النیسابوری الحاکم ابوعبداللہ الحافظ‘ صاحب تصانیف ہیں‘ امام ہیں‘ صدوق ہیں‘ لیکن اپنی کتاب ’’المُستدرك‘‘ میں بہت سی گری پڑی احادیث کو صحت کا درجہ عطا کر دیتے ہیں اور مجھے نہیں معلوم کہ ان کی حقیقت سے وہ واقعی ناواقف تھے۔ ان جیسے شخص سے ایسی بات کا مخفی رہنا بعید ہے‘ اور وہ علم ہونے کے باوجود ایسا کرتے تھے تو یہ ایک بہت بڑی خیانت ہے۔ مستزاد یہ کہ وہ مشہور شیعہ ہیں لیکن شیخین (ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما) کے بارے میں کچھ نہیں کہتے۔ ابن طاہر کہتے ہیں میں نے ابواسماعیل عبداللہ الانصاری سے ابوعبداللہ الحاکم کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے کہا: حدیث میں امام ہیں اور خبیث رافضی بھی ہیں۔

پھر ذہبی کہتے ہیں: ’’میں یہ کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ انصاف کو پسند کرتے ہیں‘ وہ رافضی نہیں ہیں فقط شیعہ ہیں‘‘۔ مزید کہا: ’’اُمت کا اجماع ہے کہ الضبی (الحاکم) کذاب ہے اور اس کا یہ کہنا کہ مصطفیٰ ﷺ کی ولادت اس حال میں ہوئی کہ وہ ختنہ شدہ تھے‘ تواتر کی حیثیت رکھتا ہے اور یہ کہنا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے وصیت کی تھی‘ البتہ بذات خود سچے ہونے میں اور ان معاملات کی خبر رکھنے میں کوئی اختلاف نہیں۔ ان کی وفات ۴۰۵ھ میں ہوئی۔‘‘(۶)

☆ ذہبی ’’لسان المیزان‘‘ میں لکھتے ہیں:

’’الحاکم اپنی قدر و منزلت‘ اہمیت اور ناموری کی بنا پر اس بات سے اعلیٰ و ارفع ہیں کہ ان کا نام ضعیف راویوں میں لکھا جائے۔ ان کی طرف سے یہ عذر بیان کیا جاتا ہے کہ اپنی کتاب ’’المُستَدرك‘‘ کی تالیف کے وقت وہ اپنی عمر کے آخری حصے میں تھے‘ اور کچھ لوگوں نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ آخر عمر میں وہ غفلت اور تبدیلیٔ حال کا شکار ہو گئے تھے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ انہوں نے اپنی کتاب ’’الضُّعَفَاء‘‘ میں کچھ راویوں کا ذکر کیا ہے اور ان سے روایت نہ کرنے کا بالجزم ذکر کیا ہے‘ پھر ’’المُستَدرك‘‘ میں ان میں سے بعض راویوں کی احادیث کو بھی درج کیا ہے اور انہیں صحیح قرار دیا ہے‘ جیسے عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم کی حدیث حالانکہ وہ انہیں ’’الضُّعَفَاء‘‘ میں شمار کر چکے ہیں

اور وہاں ان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اس نے اپنے باپ سے موضوع احادیث کی روایت کی ہے۔ اس علم کی مہارت رکھنے والے ادنیٰ تامل سے یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ وہ خود اس کے ذمہ دار ہیں۔‘‘

اپنی کتاب کے آخر میں لکھتے ہیں:

’’یہ وہ لوگ ہیں جن کا میں نے اپنی کتاب میں ذکر کیا ہے‘ میرے نزدیک ان کی سچائی ثابت ہو چکی ہے‘ اس لیے کہ میں جرح اسی وقت قبول کرتا ہوں جب وہ تفصیل سے بیان کی گئی ہو‘ میں کسی کی تقلید میں اسے جائز روا نہیں رکھتا۔ ایسے لوگوں کی احادیث کے بارے میں‘ میں طلبہ کو یہی مشورہ دوں گا کہ وہ ان کی احادیث قطعاً نہ لکھیں۔‘‘(۷)

☆ ذہبی بشر المریسی کے بارے میں ایسا ہی لکھتے ہیں کہ:

’’وہ شر والے بشر ہیں جیسے بشر الحافی خیر والے بشر ہیں‘ جیسے احمد بن حنبل سنت والے احمد ہیں اور احمد بن ابی داؤد بدعت والے احمد ہیں۔‘‘

’’اور ایک شخص چاہے کتنی ہی بڑی بدعت کی وجہ سے کافر قرار دیا جائے وہ اصلی کافر یا یہودی یا مجوسی کی مانند نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ایک ایسے شخص کو جو اللہ‘ اس کے رسول اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتا ہو‘ پھر نماز‘ روزہ‘ حج‘ زکوٰۃ پر عامل ہو‘ چاہے وہ کچھ بڑے منکرات اور بدعت کا مرتکب ہو کر گمراہ بھی ہو چکا ہو‘ اس شخص کے برابر کیسے قرار دیا جا سکتا ہے جو رسول کا دشمن ہو‘ بتوں کی عبادت کرتا ہو‘ شریعتوں کا منکر ہو‘ کفر کا مرتکب ہو۔ اور ہم خود بدعت اور اہل بدعت سے اللہ کے ہاں براءت کا اظہار کرتے ہیں۔‘‘(۸)

یہ نہایت خوبصورت بات ہے کہ اس مسلمان کے جس پر کفر کا حکم لگایا گیا ہو اور اصلی کافر کے درمیان فرق روا رکھا جائے‘ اور یہ کہا جائے کہ اس کا کفر اصلی کفر کی مانند نہیں ہے‘ جو اسے ملت سے باہر نہیں کرتا اور یہ کہ وہ عملی نفاق کی طرح عملی کفر کا درجہ رکھتا ہے۔ اسحاق بن راہویہ‘ ابوعبید قاسم بن سلام کی علمی فضیلت کا اقرار کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ’’اللہ تعالیٰ حق کو پسند کرتے ہیں‘ ابوعبید القاسم بن سلام مجھ سے زیادہ علم اور فقہ رکھتے ہیں۔‘‘(۹)

امام احمد بن حنبل اسحاق کے بارے میں کہتے ہیں: ’’اسحاق کی مانند کوئی دوسرا ایسا شخص نہیں دیکھا جو پُل پار کر کے خراسان آیا ہو‘ گو انہوں نے بعض باتوں میں ہم سے اختلاف کیا‘ لیکن یہ تو دستورِ دنیا ہے کہ لوگ ایک دوسرے کی مخالفت کرتے چلے آئے ہیں۔‘‘(۱۰)

حواشی

(۱) باقی اسباب کا مع حوالہ جات بعد میں ذکر آ رہا ہے۔
(۲) هداية الحَيارى' ۱:۹۷۔
(۳) أدب الطلب ومُنتهى الأرب' ۳۱:۱۲۱۔
(۴) الفتاوىٰ ۱:۴۹' چھٹے ضابطے میں یہ بات مذکور ہو چکی ہے۔
(۵) المجموع ۲۸:۱۸۸۔۱۸۹۔ (۶) میزان الاعتدال : ترجمہ نمبر ۷۸۰۴۔
(۷) لسان المیزان' ۵:۲۳۲۔ (۸) سیر اعلام النبلاء ۱۰:۲۰۲۔
(۹) ایضاً ۱۰:۴۹۰'۵۰۹ بحوالہ ترجمة ابی عبید' نزهة الفضلاء' ۷۷۵۔
(۱۰) ایضاً ۱۱:۳۵۸'۳۸۳ بحوالہ ترجمہ اسحاق بن راھویہ' نزهة الفضلاء' ۸۴۰۔

ضابطہ نمبر۱۳:

عدل کا دامن تھامے رہنا

یہ ضابطہ پچھلے ضابطے کا تتمہ ہے' دونوں میں یا تو بہت لطیف سا فرق ہے یا نہ ہونے کے برابر ہے' لیکن علیحدہ ذکر کرنے میں وضاحت اور زیادہ ہو جاتی ہے۔

دینِ اسلام جن بنیادوں پر قائم ہے ان میں ایک ''عدل'' ہے جس کا مطلب ہے لوگوں کو بغیر کسی کمی کے ان کے حقوق دینا' چاہے وہ مادّی حقوق ہوں یا معنوی حقوق ہوں۔ اللہ عزوجل ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۚ وَبِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿۱۵۲﴾﴾ (الانعام)

''اور جب تم بات کرو تو انصاف کرو خواہ وہ شخص قرابت دار ہی ہو' اور اللہ تعالیٰ سے جو عہد کیا اس کو پورا کرو۔ ان کا اللہ تعالیٰ نے تم کو تاکیدی حکم دیا ہے تاکہ تم یاد رکھو۔''

اور پھر ارشاد فرمایا:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ۫ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰۤى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا ۟ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۫ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۸﴾﴾ (المائدة)

''اے ایمان والو! تم اللہ کی خاطر حق پر قائم ہو جاؤ' راستی اور انصاف کے ساتھ گواہی دینے والے بن جاؤ' اور کسی قوم کی عداوت تمہیں خلافِ عدل پر آمادہ نہ کرے۔ عدل کیا کرو' جو پرہیزگاری کے زیادہ قریب ہے' اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو' یقین مانو کہ اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال سے باخبر ہے۔''

مفسّر بیضاوی ﴿وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰۤى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ﴾ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ یہاں حرف ''عَلٰی'' لا کر کسی چیز پر ابھارنے کا مفہوم لایا گیا ہے۔ تو پھر معنی یہ ہوا کہ مشرکین سے شدید نفرت تمہیں ان کے بارے میں انصاف کرنے سے نہ روکے اور پھر تم ان کے ساتھ وہ کچھ کرو جو جائز نہیں' جیسے لاش کا مُثلہ کرنا' بدکاری کی تہمت لگانا' بچوں عورتوں کو قتل کرنا' عہد کو توڑنا' تاکہ تمہارا کلیجہ ٹھنڈا ہو۔

پھر فرمایا: ﴿اِعْدِلُوْا ۟ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۫﴾ یعنی انصاف کرنا تقویٰ کے زیادہ قریب ہے۔ عدل کرنے کا صاف صاف حکم دیا' اور خواہشات کے پیچھے لگنے کے نتیجے میں ظلم و جور سے منع کرنے کے بعد بتایا کہ عدل کا تقویٰ کی میزان میں کیا درجہ ہے۔ اگر کفار کے ساتھ بھی اس درجے کا عدل مطلوب ہے تو اہل ایمان کے ساتھ عدل کا کیا مقام ہوگا۔[۱]

اسی آیت کے بارے میں ابن تیمیہ لکھتے ہیں:

''اس بات سے روکا کہ کفار کی نفرت کہیں تمہیں ان کے ساتھ عدل کرنے سے نہ روک دے۔ تو اگر اہل ایمان میں سے کسی فاسق یا بدعتی تاویل کرنے والے سے نفرت پائی جاتی ہو تو پھر اس کے ساتھ انصاف کرنا تو اور زیادہ ضروری ہوا' چاہے اس نے ظلم کیوں نہ کیا ہو۔ یہ مقام دین و دنیا کے اعتبار سے بڑے نفع کا مقام ہے' کیونکہ شیطان بنی آدم کو گمراہ کرنے پر مامور ہے' اس کے پنجے کا شکار سبھی ہوتے ہیں' کوئی بھی ایسی باتوں سے بچا ہوا نہیں ہے۔ پھر ان باتوں کا کیا کہنا جو اس قسم کی ہوں کہ بربنائے اجتہاد یا غیر اجتہاد کسی حکم کے بجالانے میں یا کسی ناجائز چیز کے ارتکاب میں تقصیر واقع ہو جائے' چاہے وہ حق ہی کیوں نہ ہو۔''[۲]

ابن تیمیہ نے یہ بھی ارشاد فرمایا:

''اور جو شخص اپنے مخالفین کے ساتھ انصاف نہیں کرتا اور ان کے لیے اجتہادی غلطی کا عذر تسلیم نہیں کرتا بلکہ اس حد تک چلا جاتا ہے کہ انہیں دشمنی کی نگاہ سے دیکھتا ہے یا ان کی تکفیر کرتا ہے تو وہ خود اپنی جان پر ظلم کرتا ہے۔ اہلِ سنت اور اصحابِ علم و ایمان ایسے نہیں

ہیں‘ وہ حق کو پہچانتے ہیں اور مخلوقِ خدا پر رحم کرتے ہیں۔‘‘

اور پھر ارشاد فرماتے ہیں:

’’اللہ تعالیٰ علم و عدل پر مبنی کلام کو پسند کرتے ہیں اور جہالت و ظلم پر مبنی کلام کو ناپسند فرماتے ہیں۔ جیسا کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: ’’قاضی تین طرح کے ہوتے ہیں‘ دو آگ میں جانے والے اور ایک جنت میں! وہ شخص جس نے جہالت پر مبنی فیصلہ کیا وہ جہنم میں گیا اور وہ شخص جو حق کو جاننے کے باوجود اس کے خلاف فیصلہ کرتا ہے وہ بھی جہنم میں‘ اور جس نے حق کو جاننے کے بعد اس کے مطابق فیصلہ کیا وہی جنت کا مستحق ہوگا۔‘‘(۳)

اور پھر کہا:

’’ہمیں عدل و انصاف کا حکم دیا گیا ہے‘ اگر ایک یہودی یا نصرانی چہ جائیکہ وہ رافضی ہو‘ حق کی بات کہے تو ہمیں اسے رد نہیں کرنا چاہیے‘ ہم رد کریں مگر اتنا ہی جتنا باطل اس میں پایا جاتا ہے نہ کہ حق کو۔‘‘(۳)

ابن تیمیہؒ سے ایسے شخص کے بارے میں سوال کیا گیا جو ایک رافضی پر یہود اور نصاریٰ کو فوقیت دیتا ہے تو انہوں نے جواب دیا:

’’الحمدللہ! جو شخص ہر اُس چیز پر جو محمد ﷺ لے کر آئے‘ ایمان لایا‘ وہ اس سے بہتر ہے جو ان سب کا انکار کرتا ہے‘ چاہے اس مؤمن میں بدعت کی کوئی قسم کیوں نہ پائی جاتی ہو‘ چاہے یہ بدعت خوارج کی ہو یا شیعہ‘ مرجئہ یا منکرینِ تقدیر وغیرہ کی ہو کیونکہ یہود و نصاریٰ کا کفر دینِ اسلام میں اضطراری طور پر معلوم ہے۔ ایک بدعتی اگر یہ سمجھتا ہو کہ وہ رسول کا مخالف نہیں بلکہ موافق ہے تو وہ کافر نہ ہوگا‘ اور اگر فرض کرلیں کہ وہ کافر ہی ہے تب بھی اس کا کفر اس شخص کی مانند نہیں ہے جو رسول ﷺ کو جھٹلاتا ہو۔‘‘(۴)

خیر و شر کے درجات کے درمیان مقابلہ کرتے ہوئے وہ ارشاد فرماتے ہیں:

’’خیر و شر کے درجے ہیں‘ کچھ لوگ اپنی سابقہ حالت سے ایک بہتر حالت میں منتقل ہو کر ان درجات سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ بہت سے رافضی‘ جہمی عقائد کے لوگ بلادِ کفار گئے اور ان کے ہاتھوں پر بہت سی مخلوقِ خدا مسلمان ہوئی اور ان سے فیض یاب ہوئی۔ گو وہ بدعتی مسلمان بنے‘ لیکن یہ ان کے لیے کافر بننے سے بہتر تھا۔‘‘(۵)

ایک رافضی عورت سے شادی کے بارے میں ان سے سوال کیا گیا تو جواب دیا:

’’خالص رافضی بدعتی ہیں‘ گمراہ ہیں‘ خواہش کے پیروکار ہیں‘ ایک مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ وہ جس عورت کا ولی ہے اسے ایک رافضی سے بیاہ دے۔ اگر اس نیت کے ساتھ رافضی عورت سے شادی کرلے کہ وہ شاید توبہ کرلے گی تو اس کا نکاح درست ہوگا۔ ویسے ایسی عورت سے نکاح نہ کرنا ہی افضل ہے تاکہ وہ اس کے بچوں کو بھی نہ بگاڑ دے۔ اور اللہ بہتر جانتے ہیں۔‘‘(۶)

ان حوالوں سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ —— اللہ ان پر رحمت کرے —— رافضیوں کو کافر قرار نہیں دیتے۔ اگرچہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ لوگ امت کے لیے بڑے خطرے کا باعث ہیں‘ پھر بھی انہوں نے ان کے بارے میں انصاف سے کام لیا۔ دیکھئے انہوں نے ان کو بدعتی کہا ہے اور جو کچھ وہ کر رہے ہیں اسے معصیت قرار دیا ہے کہ جو توبہ کی محتاج ہے۔ کافر کو یہ نہیں کہا جاتا کہ توبہ کرو‘ بلکہ یہ کہا جاتا ہے کہ اسلام قبول کرو۔

ہاں! مذکورہ رائے میں وہ لوگ شامل نہیں جو قرآن کے مخالف اعتقاد رکھتے ہوں یا ایسا عقیدہ رکھتے ہوں جو دین ہی کو باطل قرار دے دے۔ ایسے عقائد کفریہ عقائد ہیں‘ لیکن کسی ایک متعین شخص کی بغیر کسی کھلی دلیل کے تکفیر کرنا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔

حواشی

(۱) تفسیر بیضاوی‘ سورۃ المائدۃ‘ آیت ۸۔ (۲) الاستقامہ ۱:۳۸۔

(۳) أدب الطلب و منتهى الأرب‘ ۳۱:۱۲۱۔

(۴) الفتاوی ۱:۴۹‘ چھٹے ضابطے میں یہ بات مذکور ہو چکی ہے۔

(۵) المجموع ۲۸:۱۸۸۔۱۸۹۔ (۶) میزان الاعتدال: ترجمہ نمبر ۷۸۰۴۔

(۷) لسان المیزان‘ ۵:۲۳۲۔ (۸) سیر اعلام النبلاء ۱۰:۲۰۲۔

(۹) ایضاً ۱۰:۴۹۰‘ ۵۰۹ بحوالہ ترجمة ابی عبید‘ نزهة الفضلاء‘ ۷۷۵۔

(۱۰) ایضاً ۱۱:۳۵۸‘ ۳۸۳ بحوالہ ترجمہ اسحاق بن راهویه‘ نزهة الفضلاء‘ ۸۴۰۔

جہاد فی سبیل اللہ
اصل حقیقت‘ اہمیت و لزوم اور مراحل و مدارج
بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کا ایک جامع خطاب

مولانا محمد منظور نعمانیؒ اور ابّا جی

(گزشتہ سے پیوستہ)

بسلسلہ حاجی عبد الواحد صاحبؒ کی یادداشتیں (۱۸)

مرتّب: پروفیسر حافظ قاسم رضوان

''تحدیثِ نعمت'' (ترتیب عتیق الرحمٰن سنبھلی) میں کچھ مخلص ہستیوں اور مشائخ عظام کا بھی ذکر آتا ہے، جن سے مولانا محمد منظور نعمانیؒ کا قریبی تعلق رہا۔ ان میں سے چند بزرگوں کا ذکر خیر درج ذیل ہے۔

مولانا نعمانی کو حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی پہلی زیارت اس وقت ہوئی جب آپ دار العلوم مئو (ضلع اعظم گڑھ) میں تحصیل علم کر رہے تھے۔ اس دوران ۱۳۴۲ھ میں حضرت تھانوی کی وہاں آمد، اصلاحی مجلس اور خطاب ہوا۔ بعد میں مولانا نعمانی کا حضرت تھانوی سے تعلق مزید بڑھا، باہمی خط و کتابت اور خانقاہ تھانہ بھون (مسکن حضرت تھانویؒ) بھی آپ کا آنا جانا ہوا۔ خانقاہ تھانہ بھون میں مولانا نعمانی کی دوسری حاضری اور ان کی زبانی ایک غیر معمولی واقعہ کا ذکر یوں ملتا ہے:

''میری تعلیم دیوبند کی تھی، اور اس سے پہلے جن دوسرے مدارس میں پڑھا تھا، ان کے اساتذہ بھی دار العلوم کے ہی فیض یافتہ تھے۔ اسی وجہ سے میرا سیاسی ذہن وہی تھا جو حضرت شیخ الہندؒ کے اثر سے اور پھر خلافت کی تحریک سے جماعت دیوبند کا بن گیا تھا۔ اسی بنا پر شروع سے ہی جمعیت العلماء (ہند) سے تعلق رہا۔ اگرچہ جمعیت کی سیاسی سرگرمیوں میں میرا کوئی قابل ذکر عملی حصہ کبھی نہیں رہا، لیکن جس زمانے کی میں اس وقت بات کر رہا ہوں، اس زمانے میں میرا ذہنی اور فکری تعلق جمعیت سے خاصا گہرا تھا۔ اس کے صدر حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ اور ناظم حضرت مولانا احمد سعید صاحب خاص عنایت و شفقت کا معاملہ فرماتے تھے۔ الفرقان

اس زمانہ میں چونکہ دہلی میں چھپتا تھا، اس لیے ہر مہینے چار پانچ دن کے لیے مجھے دہلی جانا پڑتا تھا، اور وہاں قیام زیادہ تر جمعیت العلماء کے دفتر میں اور کبھی جامع مسجد کے قریب حضرت مفتی صاحبؒ کے کُتب خانہ رحیمیہ کی بالائی منزل پر ہوتا تھا۔ اس وجہ سے ان بزرگوں کی خدمت میں حاضری اور گفتگو کا بہت موقع ملتا تھا۔

اپنے بڑوں کے سامنے بھی بولنے کی اور اگر رائے میں اختلاف ہو تو صفائی سے اس کے بھی عرض کر دینے کی، بُری یا اچھی، میری عادت شروع سے ہی رہی ہے۔ حضرت مفتی صاحب غالباً اس کی قدر فرماتے تھے، اور اگرچہ میں مرکزی جمعیت کی عاملہ کا رکن کبھی نہیں رہا، مگر اس کے اہم جلسوں میں بھی حضرت مفتی صاحب اکثر طلب فرما لیتے تھے۔ جمعیت کے اس وقت کے نظام میں تیسری اہم شخصیت حضرت مولانا محمد سجاد صاحب (نائب امیر شریعت، بہار) کی تھی۔ جمعیت کے کاموں ہی کے سلسلہ میں مہینوں ان کا قیام دہلی جمعیت کے دفتر میں ہی رہتا تھا۔ اس وجہ سے ان سے باتیں کرنے کا بہت موقع ملتا تھا۔ میں ان کے علمی رسوخ اور فقیرانہ زندگی سے بہت متاثر تھا، اور خاص کر ہندوستان کے مسلمانوں کے مسائل سے متعلق ان کی سیاسی بصیرت کا بہت قائل اور معتقد تھا۔

انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کی بنیاد پر ۱۹۳۶ء میں جنرل الیکشن (عام انتخابات) ہو چکا تھا اور اس کے نتیجہ میں صوبوں میں عوامی حکومتیں قائم ہو چکی تھیں، جن میں سے سات صوبوں میں کانگرسی حکومتیں تھیں، جنہوں نے اس شرط کے ساتھ حکومت قبول کی تھی کہ (صوبائی) گورنران کے کاموں میں دخل نہیں دے گا۔ اس وقت یہ بات کھل کر سامنے آ گئی تھی کہ ہندوستان جلد ہی کامل آزادی حاصل کر لے گا اور یہاں قومی جمہوری حکومت قائم ہو گی، یعنی عوام کے منتخب نمائندوں کی پارلیمنٹ اقتدار کی مالک ہو گی، اور یہ بات بھی (اس وقت) بالکل ظاہر تھی کہ وہ حکومت کانگریس ہی کی ہو گی۔ شروع سے جمعیت العلماء کے سامنے سب سے اہم مقصد یہ رہا تھا کہ آزاد ہندوستان میں شرعی نصب العین کے مطابق مسلمانوں کے لیے شرعی نظام قائم ہو سکے، آزادی کی جنگ میں کانگریس کے ساتھ جمعیت کی شرکت کا یہ ایک خاص محرک تھا۔ لیکن یہ شرکت یا جمعیت کے بہت سے ارکان کا مقامی کانگریس کمیٹیوں کا رکن بن جانا، کانگریس کے فیصلوں اور پالیسیوں پر اثر انداز ہونے کے لیے کافی نہیں تھا۔ اس حقیقت کو سامنے رکھ کر

حضرت مولانا محمد سجادؒ نے ایک اسکیم تیار کی۔ اس کا حاصل اور خلاصہ جواب یاد رہ گیا ہے‘ یہ تھا کہ جمعیت العلماء مسلمانوں کی ایک عوامی جماعت قائم کرے‘ جس کے نظام میں جمعیت کو مؤثر دخل رہے (غالباً اس کا نام ’نظامِ ملّت‘ تجویز کیا گیا تھا)۔ کانگریس کی طرح اس کی رکنیت کی فیس ہو‘ اور بہت ہلکی بس برائے نام ہو۔ ہر عاقل بالغ مسلمان کو اس کا رکن بنانے کی کوشش کی جائے اور یہ شرط ہو کہ جو آدمی اس کا رکن بنے‘ وہ لازمی طور پر کانگریس کا بھی رکن بنے۔ اس طرح سے مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد کو کانگریس کے نظام میں شریک کیا جائے اور ان سب کا رابطہ ’نظامِ ملت‘ کے واسطے سے جمعیت العلماء سے بھی رہے۔ خیال تھا کہ اس راستے سے جمعیت العلماء‘ کانگریس کے فیصلوں اور پالیسیوں پر اثر انداز ہو سکے گی۔ (یہ ملحوظ رہے کہ جمعیت العلماء اس وقت نہ عوامی جماعت تھی اور نہ انتخابی‘ اس کے نام اور عنوان کے مطابق عموماً علمائے کرام ہی اس کے ارکان ہوتے تھے۔)

حضرت مولانا محمد سجاد کا خیال تھا کہ اس طرح کی کسی تدبیر اور کوشش کے بغیر آزاد ہندوستان میں ہم اپنے وہ مذہبی وملی مقاصد حاصل نہیں کر سکیں گے‘ جن کے لیے اور جن کی امید پر ہم نے اور ہمارے بزرگوں نے قربانیاں دی ہیں اور دے رہے ہیں۔ مولانا موصوف نے یہ اسکیم بڑی تفصیل کے ساتھ مرتب کی تھی اور ابھی اس پر وہ خود اور حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب اور حضرت مولانا احمد سعید غور فرما رہے تھے (یہ ۱۹۳۷ء کا ذکر ہے)۔ انہی دنوں میرا دہلی جانا ہوا۔ حضرت مولانا محمد سجاد صاحب نے پہلے زبانی اس خیال کا ذکر فرمایا‘ پھر بتلایا کہ انہوں نے اس کا پورا خاکہ تحریری شکل میں بھی مرتب کر لیا ہے۔ میرے عرض کرنے پر وہ مجھے مطالعہ کے لیے عنایت بھی فرما دیا۔ میں نے اس کو بہت غور سے پڑھا اور میرے دل نے اس کو پوری طرح سے قبول کر لیا۔ ساتھ ہی شدت کے ساتھ دل میں یہ داعیہ پیدا ہوا کہ اس اسکیم کو بروئے کار لانے کے لیے جو کچھ کیا جا سکتا ہے‘ وہ سب کیا جائے۔ میں نے سوچا کہ سب سے پہلے یہ کوشش کرنی چاہیے کہ اپنی جماعت کے وہ اکابر بھی اس سے اتفاق کر لیں جو جمعیت العلماء اور اس کی سیاسی طرز کی سرگرمیوں سے کوئی تعلق نہیں رکھتے‘ بلکہ ان کو ایک گونہ بعد یا اختلاف رہا ہے۔ ان اکابر میں میری نظر میں سب سے اہم اور باعظمت شخصیت حکیم الامت حضرت تھانویؒ کی تھی۔ میں نے ارادہ کر لیا کہ تھانہ بھون حاضر ہو کر حضرت کی خدمت میں اس

مسئلہ کو رکھوں..... میں نے اپنے اس خیال یا خبط کا کسی سے ذکر بھی نہیں کیا‘ اور اگلے دن صبح کو جمعیت کے دفتر سے سیدھا شاہدرہ آیا اور وہاں (ریلوے اسٹیشن) سے تھانہ بھون روانہ ہو گیا۔ ٹرین میں بیٹھ کر راستے میں حضرت سے گفتگو کرنے کے لیے ایک مفصل نوٹ تیار کر لیا‘ تاکہ وقت پر کوئی ضروری بات رہ نہ جائے۔

غالباً ظہر کی نماز کے بعد حضرت سے ملاقات ہوئی‘ حسب معمول شفقت وعنایت کے ساتھ مصافحہ فرمایا‘ خیریت دریافت کی اور فرمایا: کیا اس وقت کسی خاص ضرورت کے تحت آنا ہوا؟ میں نے عرض کیا کہ ایک خاص معاملے کے بارے میں حضرت سے کچھ عرض کرنا ہے۔ فرمایا: کیا اسی وقت؟ میں نے عرض کیا: نہیں۔ میں قیام کروں گا۔ آج یا کل جس وقت حضرت کو فرصت وفراغت ہو۔ فرمایا کہ پھر آج ہی ان شاء اللہ مغرب کے بعد.....

مغرب کی نماز کے بعد خانقاہ کی مسجد ہی کے ایک کنارے چٹائی پر حضرت بیٹھ گئے‘ وہیں مجھے یاد فرمایا‘ میں حاضر ہو گیا۔ سب سے پہلے میں نے عرض کیا کہ میں اس وقت جو کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں‘ اس کے بارے میں مجھے شبہ ہے کہ شاید حضرت اس کو پسند نہ فرمائیں‘ لیکن بہت غور کرنے کے بعد میں نے اپنے لیے یہ ضروری سمجھا ہے کہ حضرت کی خدمت میں اس کو عرض کر دوں۔ حضرت نے بڑی عنایت وشفقت کے ساتھ فرمایا کہ آپ پوری بے تکلفی کے ساتھ اپنی بات کہیں‘ میں بالکل خالی الذہن ہو کر سنوں گا اور غور کروں گا۔

میں نے جیب سے وہ کاغذ نکالا جس پر وہ سب باتیں میں نے نمبروار نوٹ کر لی تھیں‘ جو مجھے حضرت کے سامنے عرض کرنی تھیں۔ حضرت نے اس پر خوشی اور تحسین کا اظہار فرمایا کہ میں نے گفتگو کے لیے اہتمام سے تحریری یادداشت مرتب کر لی ہے۔ اس کے بعد میں نے اپنی بات شروع کی‘ جس کا سلسلہ تقریباً ایک گھنٹہ تک جاری رہا۔ حضرت نہایت توجہ کے ساتھ سنتے رہے۔ درمیان میں کبھی کبھی یہ فرما دیتے کہ اس بات کو ذرا پھر سے کہہ دیجیے‘ میں دوبارہ عرض کر دیتا۔ میں نے جو کچھ عرض کیا تھا‘ وہ سب تو اب محفوظ نہیں‘ لیکن اس کے اہم اجزاء‘ جہاں تک یاد ہے‘ یہ تھے:

(۱) انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کی کچھ وضاحت اور یہ کہ اس کے ذریعے حکومتی اختیارات کا کتنا بڑا حصہ ہندوستانیوں کے ہاتھ میں آ گیا ہے اور کتنا حکومت برطانیہ نے اپنے ہاتھ میں

رکھا ہے۔

(ب) اب یہ بات یقینی نظر آتی ہے کہ جلد ہی انگریزی اقتدار کُلّی طور پر ختم ہو جائے گا اور سارے اختیارات ہندوستانیوں کے ہاتھ میں آ جائیں گے۔ اور یہاں قومی جمہوری حکومت قائم ہوگی‘ جس طرح اس وقت صوبوں میں عوامی حکومتیں قائم ہیں۔

(ج) یہ بھی ظاہر ہے کہ انتخابات کے ذریعے یہاں حکومت کانگریس ہی کی قائم ہوگی اور سارے اختیارات اس کے ہاتھ میں ہوں گے۔

(د) آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے ہم جو کچھ چاہتے ہیں‘ بالخصوص ان کے لیے اپنے نظامِ شرعی کا حق‘ اس کا بظاہر اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہے کہ کانگریس کے فیصلوں اور پالیسیوں میں دینی مزاج کے مسلمانوں کا بھی عمل دخل ہو۔

(ہ) اس کے بعد میں نے حضرت مولانا محمد سجاد صاحب کی تجویز اور اسکیم کا کسی قدر تفصیل سے ذکر کیا‘ اور عرض کیا کہ یہ اسی صورت میں کامیاب ہو سکتی ہے جب اس کو ہمارے دینی حلقوں کی زیادہ سے زیادہ تائید و حمایت حاصل ہو‘ اور ہم سب اس کے لیے کوشش اور محنت کریں جو کانگرسی مسلمان دینی ذہن کے نہیں ہیں‘ وہ تو اس کی مخالفت کریں گے۔

آخر میں‘ میں نے عرض کیا کہ حضرت اس مسئلہ پر غور فرمائیں۔ اور اگر حضرت کی رائے اس سے متفق ہو اور اس بارے میں شرح صدر ہو جائے کہ یہ کوشش اسلام اور مسلمانوں کے لیے ان شاء اللہ مفید ہوگی‘ تو پھر حضرت اس کی تائید فرما دیں۔ پھر ان شاء اللہ مخلص اور دین دار مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد کا تعاون حاصل ہو جائے گا اور اس وسیع پیمانے پر کام ہو سکے گا‘ جس کی ضرورت ہے..... جب میں نے اپنی بات ختم کی اور عرض کیا کہ جو مجھے عرض کرنا تھا‘ وہ میں عرض کر چکا‘ تو حضرت نے فرمایا: ’’میں نے آپ کی بات اور مقصد کو سمجھنے کی پوری کوشش کی ہے‘ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے۔ مجھے اس وقت بہت سی ایسی باتیں معلوم ہوئیں‘ جن کا معلوم ہونا ضروری تھا۔ میرا طریقہ یہ ہے کہ میں جلدی رائے قائم نہیں کرتا ہوں‘ پہلے خود اچھی طرح غور کرتا ہوں‘ پھر ضرورت سمجھتا ہوں تو ان دوستوں سے مشورہ بھی کرتا ہوں جن کو مخلص اور صاحب رائے سمجھتا ہوں‘ اس لیے اپنی رائے تو اس وقت ظاہر کر سکوں گا جب قائم ہو جائے گی۔ لیکن میرا حال اس وقت یہ ہے کہ آپ کی بات نے میرے دل کو بہت متاثر کیا ہے اور میرا

جی چاہتا ہے کہ اس سے پوری طرح اتفاق کر لوں‘ لیکن میں غور کر کے رائے قائم کروں گا اور ان شاء اللہ کل صبح بتلا دوں گا کہ میری رائے کیا قائم ہوئی۔‘‘

اگلی صبح فجر کی نماز کے بعد حضرت نے مسجد میں ہی مجھ سے فرمایا: ’’میں نے غور کیا‘ میری رائے وہی ہے جو میں نے رات ظاہر کی تھی۔ اب میں یہاں کے اپنے خاص احباب سے مشورہ کروں گا‘ لیکن اس کی صورت یہ ہوگی کہ آپ نے جس طرح میرے سامنے پوری تفصیل سے بات رکھی تھی‘ اسی طرح ان کے سامنے بھی آپ رکھیں۔ میں ان کو اطلاع دوں گا کہ وہ آٹھ بجے یہاں خانقاہ ہی آ جائیں۔‘‘

وہ حضرات آٹھ بجے جمع ہو گئے۔ ان میں سے ایک حضرت مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی تھے‘ دوسرے مولانا مفتی عبدالکریم صاحب گمتھلوی تھے‘ جو حضرت حکیم الامت کے ممتاز اصحابِ علم خلفاء میں سے تھے‘ تیسرے صوبہ بہار کے ایک عالم تھے جو اس زمانہ میں خانقاہ کے مدرسہ میں غالباً صدر مدرس تھے (نام اب یاد نہیں)‘ ان کے علاوہ حضرت مولانا خیر محمد صاحب جالندھری بھی تھے۔ غالباً صرف یہی چار حضرات تھے۔ حضرت حکیم الامت نے ان حضرات سے مخاطب ہو کر میرا نام لے کر ارشاد فرمایا: ’’رات انہوں نے ایک بہت اہم مسئلہ پر مجھ سے بات کی‘ میں نے آپ حضرات کو اس وقت اس لیے جمع کیا ہے کہ آپ بھی اس کو سنیں‘ اس پر غور کریں اور مشورہ دیں۔‘‘

اس کے بعد میری طرف مخاطب ہو کر ارشاد فرمایا کہ جو بات آپ نے جس طرح تفصیل کے ساتھ مجھ سے کہی تھی‘ اسی طرح ان حضرات کے سامنے بھی آپ وہ بات رکھیں۔ میں نے اس مجلس میں بھی پوری تفصیل اور وضاحت کے ساتھ مسئلہ کو رکھا۔ جب میں اپنی بات پوری کر چکا‘ تو حضرت نے ان حضرات سے فرمایا کہ اب آپ حضرات اس مسئلہ میں اپنی اپنی رائے ظاہر فرمائیں۔ یہ سب حضرات خاموش رہے۔ کچھ دیر کے بعد حضرت نے دوبارہ یہی فرمایا‘ اس پر بھی کسی نے اپنی کوئی رائے ظاہر نہیں کی اور خاموشی ہی رہی۔ تو حضرت نے فرمایا کہ میں نے رات سے اب تک اس مسئلہ پر جو کچھ غور کیا ہے‘ اس کی بنا پر میرا رجحان تو یہ ہے کہ مولانا (یعنی راقم سطور) نے جو بات ہمارے سامنے رکھی ہے‘ وہ صحیح ہے اور ہمیں اسے قبول کر لینا چاہیے۔ یہ خیال ہمارے لیے مانع نہیں ہونا چاہیے کہ تحریکات کے بارے میں اب تک جو ہمارا

طریقہ اور مسلک رہا ہے‘ یہ اس کے خلاف ہے۔ ہماری اب تک جو رائے رہی اور ہم نے جو کچھ کیا‘ حق سمجھ کر کیا اور اللہ کے لیے کیا‘ اور اب اگر یہ رائے قائم ہو جائے کہ یہ دوسرا طریقہ جمعیت علماء والے حضرات کا صحیح ہے اور اس سے اسلام اور مسلمانوں کے حق میں خیر کی اُمید ہے‘ تو اس کو بھی ہم اللہ ہی کے لیے اختیار کریں گے۔ اگر اس رائے کے بارے میں اطمینان اور شرحِ صدر ہو جائے تو پھر میں اپنی ذات سے اس کے لیے تیار ہوں کہ جمعیت العلماء میں شامل ہو جاؤں اور کانگریس کا بھی ممبر بن جاؤں۔

حضرت (تھانویؒ) کی زبان سے یہ آخری بات سن کر میں حیران رہ گیا۔ اس حد تک تو میرا وہم و خیال بھی نہیں جا سکتا تھا‘ میں تو زیادہ سے زیادہ بس تائید اور حمایت ہی کی توقع کر سکتا تھا..... حضرت مولانا خیر محمد جالندھری نے اصولی طور پر حضرت کی رائے سے اتفاق ظاہر کرتے ہوئے عرض کیا کہ میری گزارش یہ ہے کہ حضرت اپنی ذات کے بارے میں تو ابھی کوئی اقدام اور اعلان نہ فرمائیں‘ بس زیادہ سے زیادہ تائید فرما دیں‘ لیکن اپنے خاص معتمد چند حضرات کو ارشاد فرما دیں کہ وہ شامل ہو جائیں اور دو یا تین مہینے کی مدت مقرر کر دی جائے۔ اس مدت میں وہ جمعیت العلماء کے حضرات کے ساتھ کام کر کے حضرت کی خدمت میں اپنا تجربہ اور اپنی رائے عرض کریں‘ اس کے بعد اپنی ذات کے بارے میں حضرت کوئی فیصلہ فرمائیں۔ میں نے حضرت مولانا جالندھری کی اس رائے کی تائید کی‘ حضرت نے بھی اس کو پسند فرمایا‘ اور اس حد تک بات اس مجلس میں گویا طے پا گئی۔

اس کے بعد حضرت نے فرمایا کہ اب اس کی ضرورت ہے کہ خود جمعیت العلماء کے حضرات سے بھی گفتگو ہو۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت ارشاد فرمائیں تو میں دہلی چلا جاؤں اور ان حضرات سے عرض کروں‘ ان شاء اللہ وہ ضرور تشریف لے آئیں گے۔ چنانچہ میرا دہلی جانا طے ہو گیا۔ مجھے حضرت نے ایک رقم بھی عنایت فرمائی‘ یہ میرے اور ان اکابر جمعیت کے کرایہ کے لیے تھی۔ پھر حضرت نے فرمایا کہ یہ بہتر ہوگا کہ دیوبند اور سہارنپور کے حضرات بھی اس مشورہ میں شریک ہوں۔ چنانچہ طے ہو گیا کہ فلاں صاحب حضرت کا خط لے کر سہارنپور اور دیوبند جائیں گے۔ صرف ایک دن درمیان میں چھوڑ کر دوسرے دن صبح کا وقت اس مشاورت کے لیے مقرر کیا گیا۔

میں اسی دن دہلی روانہ ہو گیا۔ سب سے پہلے جمعیت کے دفتر پہنچا‘ وہاں مولانا سجاد صاحب تشریف فرما تھے۔ ان کو تھانہ بھون کے اپنے سفر کی روداد سنائی اور عرض کیا کہ آپ کو‘ حضرت مفتی صاحب اور مولانا احمد سعید صاحب کو تھانہ بھون تشریف لے چلنا ہے‘ میں اسی لیے آیا ہوں۔ مولانا کو یہ سن کر کہ حضرت تھانوی اس حد تک آمادہ ہو گئے ہیں‘ بڑی حیرت ہوئی اور مولانا اسی وقت مجھے اپنے ساتھ لے کوچۂ چیلاں‘ حضرت مفتی (کفایت اللہ) صاحب کے ہاں پہنچے۔ وہاں بھی میں نے پوری تفصیل سے تھانہ بھون کے اپنے سفر کی روداد سنائی‘ حضرت مفتی صاحب نے بھی بڑی حیرت و استعجاب کا اظہار فرمایا۔ میں نے عرض کیا کہ آج ہی شام کو آپ حضرات کو تھانہ بھون تشریف لے چلنا ہے‘ کل صبح آٹھ بجے کا وقت گفتگو کے لیے مقرر ہے‘ سہارنپور اور دیوبند کے حضرات کو بھی بلایا گیا ہے۔ حضرت مفتی صاحب اور ان کے ساتھ ہم دونوں مولانا احمد سعید صاحب کے مکان پر پہنچے‘ جو وہیں کوچۂ چیلاں میں قریب ہی تھا۔ (لیکن وہ اس وقت ایک اہم سفر پر نگینہ روانہ ہونے کے لیے بالکل تیار تھے اور حضرت مفتی صاحب کے اصرار کے باوجود رُک نہ پائے۔ راقم)

پھر اسی دن شام کو حضرت مفتی صاحب‘ مولانا محمد سجاد صاحب اور یہ عاجز (مولانا نعمانی) شاہدرہ (ریلوے اسٹیشن سے)‘ سہارنپور ٹرین سے تھانہ بھون کے لیے روانہ ہو گئے۔ وہاں ٹرین رات کو پہنچتی تھی۔ حضرت تھانوی نے میرے دہلی جاتے وقت یہ فرما دیا تھا کہ ان حضرات کو اس میں راحت رہے گی کہ قیام مولوی شبیر علی صاحب کے مکان پر رہے‘ یہ حضرات بستر وغیرہ ساتھ لانے کی زحمت نہ اٹھائیں۔ ہم لوگ اسٹیشن پر اترے‘ خانقاہ کے خادم خلیفہ اعجاز صاحب ہاتھ میں لالٹین لیے موجود تھے‘ ان کے ساتھ ایک دو آدمی اور بھی تھے۔ اسٹیشن سے راستہ پیدل ہی کا تھا۔ خلیفہ صاحب کی رہنمائی میں ہم تینوں مولانا شبیر علی صاحب کے مکان پر پہنچے۔ وہاں بستر لگے ہوئے تھے‘ غالباً کھانے کا بھی بندوبست تھا‘ لیکن ہم سب فارغ ہو چکے تھے‘ اس لیے معذرت کر دی اور سو گئے۔ صبح فجر کی نماز کے لیے خانقاہ پہنچے‘ حسب معمول حضرت تھانوی نے خود نماز پڑھائی‘ نماز سے فارغ ہو کر ملاقات ہوئی۔ حضرت مفتی صاحب اور مولانا سجاد صاحب سے حضرت نے معانقہ بھی فرمایا‘ مزاج پرسی ہوئی۔ حضرت نے فرمایا کہ آپ حضرات کی راحت کے لیے میں نے مولوی شبیر علی صاحب کا مکان قیام کے لیے تجویز کیا

ہے‘ اس مکان میں راحت کے انتظامات زیادہ ہیں۔ چائے ناشتہ بھی مولانا شبیر علی صاحب ہی کے یہاں ہونا تھا‘ مجلس اور گفتگو کے لیے آٹھ بجے کا وقت مقرر تھا۔ ہم لوگ کچھ پہلے خانقاہ پہنچ گئے۔ حضرت تشریف لا چکے تھے۔ سہارنپور سے حضرت مولانا حافظ عبداللطیف صاحب‘ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب‘ حضرت مولانا اسعد اللہ صاحب بھی تشریف لے آئے تھے‘ وہیں ملاقات ہوئی۔ حضرت مولانا ظفر احمد صاحب‘ مولانا مفتی عبدالکریم صاحب اور حضرت مولانا خیر محمد صاحب بھی موجود تھے —— یہ بات ذکر سے رہ گئی کہ مجلس کے شرکاء میں جناب مولانا قاری محمد طیب صاحب‘ مہتمم دارالعلوم دیوبند بھی تھے —— مجلس کا آغاز ہوا‘ حضرت نے مجھ سے ارشاد فرمایا کہ اس وقت ہم سب کے یہاں جمع ہونے کا آپ ہی باعث ہوئے ہیں‘ اس کا جو مقصد ہے اور جس مسئلہ پر غور کرنا ہے‘ آپ ہی اس کو ان سب حضرات کے سامنے رکھیں۔

میں نے بات شروع کی اور تمہید کے طور پر اپنے تھانہ بھون حاضر ہونے اور حضرت کی خدمت میں اپنا ایک خاص خیال عرض کرنے کا اجمالی تذکرہ کیا‘ اور بتلایا کہ آخر میں یہ مناسب سمجھا گیا کہ اس مسئلہ کو آپ سب حضرات کے سامنے رکھا جائے اور آپ سب حضرات غور فرمائیں۔ اس کے بعد میں نے اپنی جیب سے وہ کاغذ نکالا‘ جس پر میں نے موضوع سے متعلق نمبروار نوٹ لکھ رکھے تھے‘ اور پھر جس تفصیل سے میں نے پہلے دن حضرت کی خدمت میں اور دوسرے دن خانقاہ کی خصوصی مجلس میں اپنے خیالات عرض کیے تھے‘ اسی تفصیل و وضاحت سے اس تیسری مجلس میں بھی اپنے خیالات پیش کیے۔

میں بات ختم کر چکا تو مولانا ظفر احمد صاحب نے گفتگو شروع فرمائی‘ اور آزادی کی جنگ میں کانگریس کے ساتھ اشتراک سے فقہی بنیاد پر اپنا اختلاف ظاہر کیا۔ جہاں تک یاد ہے‘ مولانا کی تقریر کا حاصل یہ تھا کہ فقہ حنفی کی کتابوں میں یہ مسئلہ مصرح ہے کہ اگر دو فریقوں میں جنگ ہو اور مسلمانوں کو یہ امید ہو کہ ان میں سے فلاں فریق کا ساتھ دینے کے نتیجہ میں کلمہ اسلام یعنی اسلامی اقتدار قائم ہو جائے گا‘ تو مسلمانوں کو اس میں شریک ہونا چاہیے‘ اور اگر جنگ کے نتیجہ میں کلمہ اسلام کی بلندی اور اسلامی اقتدار کے قائم ہونے کی امید نہ ہو‘ تو اس جنگ میں مسلمانوں کو شریک ہونا اور قربانی دینا جائز نہیں۔ مولانا ظفر احمد صاحب نے اس سلسلہ میں فقہ حنفی کی کسی کتاب کی عبارت بھی پڑھی تھی‘ جو اس وقت ان کے ساتھ تھی اور غالباً امام محمدؒ کی

''سیر کبیر'' تھی۔ حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب نے فرمایا کہ اس وقت ہم ہندوستانی مسلمانوں کے سامنے مسئلہ کی جو نوعیت ہے‘ کتاب کی اس عبارت کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس وقت ہمارے سامنے مسئلہ یہ ہے کہ کانگریس اپنے خاص طریقہ پر انگریزی حکومت کے خلاف طویل مدت سے جنگ کر رہی ہے‘ اس کی یہ جنگ اسلحہ سے نہیں ہے۔ کانگریس کی اس جنگ نے برطانوی حکومت کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ حکومتی اختیارات ہندوستانیوں کے حوالے کر دے۔ وہ اختیارات کا کافی حصہ دے بھی چکی ہے‘ اور حالات جس رفتار سے چل رہے ہیں‘ ان سے اندازہ یہ ہے کہ مستقبل قریب ہی میں برطانوی حکومت باقی اختیارات بھی ہندوستانیوں کے حوالے کرنے پر مجبور ہو جائے گی اور یہاں قومی جمہوری حکومت اس کی جگہ لے گی۔ ہم مسلمان کانگریس کا ساتھ دیں‘ جب بھی یہی ہوگا‘ اور کانگریس کا ساتھ نہ دیں‘ جب بھی یہی ہوگا‘ زیادہ سے زیادہ کچھ دیر سویر کا فرق پڑے گا۔ یہاں جو جمہوری حکومت قائم ہوگی‘ ہمیں ہرگز یہ غلط فہمی نہیں ہے اور کسی کو بھی یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیے کہ وہ اسلامی حکومت ہوگی‘ وہ ہندوستانی جمہوری حکومت ہوگی۔

اب ہم مسلمانوں کے سامنے دو راستے ہیں‘ ایک یہ کہ ہم آزادی کی اس جنگ میں کوئی حصہ نہ لیں‘ اس صورت میں جب ملک آزاد ہوگا اور یہاں جمہوری حکومت قائم ہوگی‘ تو ظاہر ہے کہ ہم اس میں مؤثر نہیں ہو سکیں گے اور ہمارے اندر سخت کمتری کا اور شرمندگی کا احساس ہوگا‘ ہم خود اپنے کو برابر کا شریک اور حق دار نہیں سمجھیں گے اور زور اور قوت سے اپنے حقوق کا مطالبہ بھی نہیں کر سکیں گے۔ اور دوسرا راستہ یہ ہے کہ ہم آزادی کی جنگ میں شریک ہوں‘ اس صورت میں ہمیں یہ امید ہے کہ جب ملک آزاد ہوگا اور یہاں جمہوری حکومت قائم ہوگی تو ہم اس میں مؤثر اور دخیل ہوں گے۔ وہ اسلامی حکومت تو نہیں ہوگی لیکن ہمارے دینی مقاصد کے لیے موجودہ انگریزی حکومت سے ہمارے لیے وہ بہتر ہوگی‘ اور ہماری حیثیت اس میں ایک ایسے شریک کی ہوگی جو جنگ اور قربانی میں بھی شریک رہا ہے..... ہم نے جہاں تک غور کیا ہے‘ ہم مسلمانوں کے لیے اس دوسرے راستہ کو صحیح سمجھتے ہیں اور ''قیما بیننا وبین اللّٰہ'' اس پر مطمئن ہیں۔

حضرت مولانا سجاد صاحب نے اس پر اتنا اور اضافہ فرمایا: لِتَكُوْنَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ

الْعُلْیَا (کلمہ اسلام کے بلند ہونے کا) اعلیٰ درجہ تو بے شک یہ ہے کہ صحیح دینی اصولوں پر اسلامی حکومت قائم ہو‘ اس کا تو ہندوستان میں کسی کے نزدیک بھی کوئی امکان اس وقت نہیں ہے‘ لیکن اس کا ایک دوسرا درجہ یہ بھی ہے کہ مذہبی امور اور معاملات کے لحاظ سے اس وقت ہماری جو حالت ہے اس سے بہتر حالت ہو جائے‘ ہم جو کچھ کر رہے ہیں‘ اسی امید پر کر رہے ہیں اور اس کا راستہ ہمارے نزدیک یہی ہے۔

حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب نے غالباً اس مرحلہ پر یہ بھی فرمایا کہ میں اس سلسلہ میں یہ بات بھی اس مجلس میں ظاہر کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس راستہ میں جس کو ہم مسلمانوں کے لیے صحیح سمجھتے ہیں اور جس کو ہم نے اختیار کیا ہے‘ بعض منکرات بھی پیش آتے ہیں‘ مثلاً ہم کانگریس کی میٹنگ میں شریک ہیں‘ اس کے ارکان میں عورتیں بھی ہیں‘ وہ بھی اس میٹنگ میں شریک ہوں گی‘ بحث و مباحثہ میں حصہ لیں گی‘ جلسہ میں تقریر بھی کریں گی‘ یہ سب کچھ ہماری موجودگی میں اور ہمارے سامنے ہوگا۔ اگر ہم شرکت ضروری سمجھتے ہیں‘ تو ہمارے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ ہم شریک رہیں اور کارروائی میں حصہ لیں‘ اور اللہ تعالیٰ سے استغفار کرتے رہیں۔ ہم نے اس پر بھی بار بار غور کیا ہے اور فیما بیننا وبین اللّٰہ ہم مطمئن ہیں کہ ان منکرات کے باوجود ہمیں کانگریس میں شریک رہنا چاہیے۔ اس طرح کے منکرات سے واسطہ تو مسلم لیگ کے جلسوں میں بھی پڑتا ہے۔

اس گفتگو میں جہاں تک اب یاد ہے‘ حضرت مولانا ظفر احمد صاحب اور حضرت مفتی صاحب اور حضرت مولانا سجاد صاحب کے سوا حاضرین میں سے کسی نے کوئی خاص حصہ نہیں لیا‘ حضرت تھانوی نے بھی اس دن اپنے کسی رجحان کا اظہار نہیں فرمایا۔ اس سے مجھے یہ خیال پیدا ہوا کہ پہلی دو گفتگوؤں کے آخر میں حضرت نے اپنے جس تاثر اور رائے کا اظہار فرمایا تھا‘ اب اس میں غالباً فرق پڑ چکا ہے اور حضرت کا موقف وہ نہیں رہا جو میرے دہلی جانے سے پہلے تھا یا کم از کم یہ کہ میں نے جو سمجھا تھا۔

یہ مجلس تقریباً تین چار گھنٹے جاری رہی۔ آخر میں حضرت تھانوی نے فرمایا کہ اب کافی وقت ہو گیا ہے اور مسئلہ سے متعلق سارے پہلو سامنے آ گئے‘ اب آپ حضرات کھانے سے فارغ ہو لیں اور آرام فرمالیں‘ چنانچہ مجلس برخواست ہوئی۔ ہم لوگوں نے مولانا شبیر علی

صاحب کے مکان پر آ کر کھانا کھایا اور آرام کیا۔ یہ شعبان کی ۱۵ تاریخ تھی‘ خود حضرت تھانوی کا اور وہاں کے اکثر دوسرے حضرات کا بھی اور غالباً سہارنپور سے آنے والے حضرات کا بھی اس دن روزہ تھا۔ ظہر کی نماز ہم لوگوں نے خانقاہ میں پڑھی۔ ظہر کے بعد حسب معمول حضرت تھانوی کی مجلس ہوئی‘ جہاں تک یاد ہے سب حضرات نے مجلس میں شرکت فرمائی۔ رات کے کھانے کا اہتمام خود حضرت تھانوی نے اپنے بڑے گھر پر کیا تھا۔ صحیح گنتی تو یاد نہیں‘ لیکن یہ یاد ہے کہ کھانے کی انواع و اقسام بہت تھیں اور حضرت نے بڑا اہتمام فرمایا تھا۔

مجلس کے موضوع پر پھر کسی گفتگو کی نوبت نہیں آئی۔ میں نے حضرت مولانا خیر محمد صاحب جالندھری سے (جو خانقاہ کے اس مجمع میں اور حضرت کے خاص معتمدین میں میرے خیالات سے نسبتاً قریب تھے) تنہائی میں دریافت کیا کہ آپ کا کیا اندازہ ہے‘ حضرت نے پرسوں کی مجلس میں اپنے جس رجحان کا اور آخر میں جس رائے کا اظہار فرمایا تھا‘ کیا اب حضرت کی رائے وہ نہیں رہی؟ انہوں نے فرمایا کہ میرا اندازہ یہی ہے کہ اب حضرت کو اس رائے پر اطمینان نہیں رہا اور مزید غور و فکر کی ضرورت محسوس فرماتے ہیں۔

اس رات میں یا اگلے دن صبح کی ٹرین سے ہم لوگوں کی تھانہ بھون سے واپسی ہو گئی۔ اس کے بعد دوسرے ذرائع سے مجھے یہ بات معلوم ہو گئی کہ حضرت (تھانوی) کی رائے کے بارے میں میرا اور مولانا خیر محمد صاحب کا اندازہ صحیح تھا.....

یہ واقعہ ۱۹۳۷ء کا ہے‘ جبکہ صوبوں میں کانگریسی حکومتوں کو قائم ہوئے چند مہینے ہی گزرے تھے۔ بعد میں ان حکومتوں کے رویہ سے مسلمانوں میں عام طور سے کانگریس سے بدظنی اور دوری بڑھتی ہی رہی۔ ان ہی چند مہینوں میں‘ خاص کر ہمارے صوبہ یوپی (موجودہ اتر پردیش) میں مسلم لیگ کا زور شروع ہوا‘ اور اس نے کانگریس اور اس کی حکومتوں کے خلاف وسیع پیمانے پر پروپیگنڈے کی مہم شروع کی (جس کے لیے کسی حد تک مواد کانگریسی حکومتوں کے رویہ نے بھی فراہم کیا)۔ اس صورت حال نے حضرت مولانا محمد سجاد صاحب کی ’نظامِ ملت‘ والی اسکیم کی کامیابی کے امکانات کو بڑی حد تک ختم کر دیا‘ اور غالباً اسی وجہ سے پھر جمعیت العلماء کے کسی جلسہ میں بھی باضابطہ (طور پر) اس پر غور و بحث کی نوبت نہیں آئی۔ حالات کی اس رفتار نے قدرتی طور پر حضرت تھانویؒ کے اس احساس کو اور آگے بڑھایا کہ کانگریس کے بارے میں

ہمارا (یعنی حضرت تھانوی اور ان کے مکتبۂ فکر) جو طرزِ عمل اور طرزِ فکر رہا ہے، وہی صحیح تھا اور صحیح ہے، اور اس طرح مسلم لیگ کے ساتھ ایک طرح کا ذہنی قرب اور ہمدردی کا جذبہ بڑھتا رہا، اور بعد میں تو کھلی حمایت کا بھی فیصلہ فرمایا۔''

(اس طویل اقتباس کو دینے کا مقصد یہ ہے کہ اس دور میں کانگریس اور مسلم لیگ کے حوالے سے مسلمانوں میں جو باہمی کشمکش مدنی اور تھانوی مکتبہ ہائے فکر کے عنوان سے تھی، اس کا بھی کچھ اندازہ ہو جائے اور اس کے پس منظر سے بھی کسی حد تک آگاہی ہو جائے۔ آگے چل کر اس کا نتیجہ جمعیت العلمائے ہند کے مقابلے میں جمعیت العلمائے اسلام کے قیام کی صورت میں نکلا۔ راقم)

کانگریسی حکومت کی چیرہ دستیوں کا اندازہ کسی حد تک (خود) مولانا نعمانی کے ان الفاظ سے ہو سکتا ہے:

''اسی زمانے میں (یعنی ۱۹۳۷ء و ۱۹۳۸ء میں) یہ ہوا کہ کانگریسی حکومتوں کے بعض معاملات اور کارروائیوں پر مسلمانوں کے تعلق سے 'الفرقان' میں سخت تنقیدیں کی گئیں، اسی کے ساتھ جمعیت العلماء سے تعلق رکھنے والے بعض ایسے حضرات کے رویہ سے (جن کو ہم لوگ اس زمانہ میں جمعیت کا بایاں بازو کہا کرتے تھے) کھل کر اختلاف کا اظہار کیا گیا۔''

اسی طرح 'الفرقان' کے اسی دور میں ایک دوسرے مضمون میں کانگریس کے بارے میں مولانا نعمانی کا ایک چشم کشا تجزیہ کچھ یوں ہے:

''بعض حضرات (جن کا ذکر پہلے ہو چکا، راقم) اس غلط فہمی میں تو مبتلا نہیں ہیں، لیکن ان کا خیال یہ ہے کہ اس وقت تو کانگریس کی ان تمام چیزوں سے چشم پوشی کر کے اس میں شامل ہو کر ملک کو آزاد کرا لو، اس کے بعد سب کچھ منوا لینا آسان ہوگا۔

درحقیقت یہ بھی نہایت غلط بلکہ مہلک تخیل ہے۔ اس سوال کو بعد کے لیے اس وقت ملتوی کیا جا سکتا تھا جبکہ کانگریس کی جنگِ آزادی خالص انقلابی ہوتی، لیکن درحقیقت اس جنگ کی نوعیت دستوری یا نیم دستوری اور نیم انقلابی ہے، اور قدیمی نظامِ حکومت کی تخریب کے ادّعاء کے ساتھ وہ (کانگریس) انگریزی حکومت سے تعاون بھی کرتی ہے اور اسی اثناء میں جدید قومی حکومت کی تدریجی تعمیر بھی کرتی جا رہی ہے۔ یہ خیال قائم کرنا (کہ اس وقت تو کانگریس جو کچھ

کر رہی ہے، کرنے دو بلکہ ہر معاملہ میں اس کی تائید و حمایت ہی کرو) اور جن غلط یا صحیح بنیادوں پر ہندوستانی اسٹیٹ / ریاست کا ارتقاء اس کے ہاتھوں ہو رہا ہے، ہونے دو، بعد میں ہم اس کو اپنی منشاء کے مطابق بنا لیں گے) ایک ایسی سطحی بات ہے، جس کو صرف بے غوری یا سادہ لوحی کا نتیجہ ہی کہا جا سکتا ہے۔'' ع اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا! (راقم)

حضرت تھانوی کی وفات سے تقریباً دو سال قبل مولانا نعمانی کو چوتھی بار حاضری کا شرف حاصل ہوا۔ ظہر کی نماز کے بعد آپ نے حضرت کی مجلس میں شرکت کی۔ اختتام پر جب حضرت کو معلوم ہوا کہ آج قیام کا ارادہ ہے، تو فرمایا کہ علالت اور ضعف کی بنا پر صرف ظہر اور عصر کی نمازیں یہاں (خانقاہ کی مسجد) پڑھتا ہوں، مغرب، عشاء اور فجر کی نماز میں نہیں آتا، اگر طبیعت بہتر رہی تو آپ کو بلا لوں گا۔ مغرب کی نماز کے بعد حضرت کی طرف سے حاضری کا پیغام ملا۔ اس موقع پر حضرت تھانویؒ نے دیگر ملفوظات کے علاوہ سلسلہ کلام میں اپنی اصول و اوقات کی پابندگی کی عادت کے بارے میں فرمایا کہ بعض اوقات دوستوں کو اس سے شکایت پیدا ہوتی ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ میں دوسروں کی رعایت نہیں کرتا، حالانکہ میں اپنے نزدیک رعایت کی پوری کوشش کرتا ہوں، ہاں یہ بھی چاہتا ہوں کہ اپنے اصول و اوقات کی بھی حتی الوسع پابندی کروں، اس سے کام میں بڑی برکت ہوتی ہے۔

مولانا تھانویؒ کی خدمت میں پانچویں بار مولانا نعمانیؒ کی آخری حاضری حضرت کی وفات (۱۶/ رجب ۱۳۶۲ھ مطابق ۱۹ جولائی ۱۹۴۳ء) سے تقریباً دو ڈھائی ماہ پہلے ہوئی۔ علالت اور ضعف کی زیادتی کی بنا پر حضرت خانقاہ تشریف نہیں لا سکتے تھے۔ آپ کی رہائش گاہ کے قریب ہی حضرت خواجہ عزیز الحسن صاحب کے مکان پر ظہر کے بعد کچھ دیر کے لیے تشریف لاتے تھے اور مجلس ہوتی تھی۔ خانقاہ کی مسجد میں ظہر پڑھ کر مولانا نعمانی اس مکان میں تشریف لے گئے اور بالارادہ اس طرح بیٹھے کہ کسی جاننے والے کو خبر نہ ہو۔ مقصد یہ تھا کہ حضرت تھانویؒ کی حالت کے پیش نظر خاموش زیارت پر اکتفا کیا جائے، حاضری کی اطلاع دینے پر خاص شفقت فرماتے ہوئے گفتگو فرمائیں گے اور طبیعت پر مزید بوجھ پڑے گا۔

مجلس کے اختتام پر خواجہ صاحب نے اعلان کیا کہ کوئی صاحب نہ تو کھڑے ہوں اور نہ ہی حضرت سے مصافحہ کریں، البتہ جو صاحبان باہر سے تشریف لائے ہیں، وہ اپنا نام اور مقام

(جگہ) بتادیں۔ آخر میں مولانا نعمانی نے عرض کیا: ''محمد منظور بھی بریلی سے حاضر ہوا ہے (اس زمانے میں میرا قیام بریلی میں تھا اور الفرقان بھی وہیں سے نکلتا تھا)۔''

حضرت تھانوی نے خاص انداز میں ارشاد فرمایا: ''مولانا! آپ نے آج غضب کر دیا' آپ تشریف رکھتے تھے' اور نہ آپ نے مجھے بتلایا اور نہ کسی اور نے بتلایا' میں برابر اپنے اندر ایک خاص قسم کی کشش کی کیفیت محسوس کر رہا تھا اور سمجھ نہیں رہا تھا کہ کیا بات ہے' اب معلوم ہوا کہ آپ تشریف رکھتے تھے۔ مولانا! قواعد وضوابط تو ہوتے ہیں' لیکن ان میں استثناءات بھی تو ہوتے ہیں (اسی سلسلہ میں ارشاد فرمایا) یہ بھی ایک سنت ہے کہ آدمی مجمع میں اس طرح بیٹھے کہ پہچانا نہ جائے۔ بعض دفعہ حضور ﷺ کی خدمت میں باہر سے آنے والے حضرات کو پوچھنا پڑتا تھا کہ **من محمد فیکم یا أیُّکم محمد**؟ (آپ لوگوں میں سے (حضرت) محمد ﷺ کون ہیں؟)..... پھر تقریباً (آپ) آدھا گھنٹہ اور تشریف فرما رہے اور برابر ارشادات وملفوظات سے نوازتے رہے' اور یہ سیہ کار خصوصیت کے ساتھ مخاطب رہا۔'' (جاری ہے)

❁❁❁

بقیہ: نسوانیتِ زن کا نگہباں ہے فقط مرد

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا وہ ہستی ہیں جن کا نام آتے ہی خواتین کے سر ادب سے جھک جاتے ہیں تو ان کا یہ قول سب کو یاد رکھنا چاہیے کہ ''عورت کے حق میں سب سے بہتر شے یہ ہے کہ نہ اس پر کسی (نامحرم) مرد کی نگاہ پڑے اور نہ وہ کسی (نامحرم) مرد کو دیکھے۔'' اگر ایسا ہو جائے تو سارے کا سارا مسئلہ ہی حل ہو جائے اور عورتوں کی بے حرمتی اور اس جیسے دوسرے واقعات کبھی رونما نہ ہوں۔

آخر میں مردوں اور عورتوں سے پھر درخواست کرتی ہوں کہ اپنی بیٹیوں کو ساتر' ڈھیلا اور موٹا لباس پہنائیں۔ انہیں دنیا تو کیا خاندان میں بھی بھرپور تحفظ فراہم کر کے دیں' ان کو اعتماد دیں اور ان کی جائز خواہشات پوری کریں۔ خود اپنی نظروں کی حفاظت کریں اور خواتین کو بھی نظروں کی حفاظت کرنا سکھائیں' تاکہ ہماری بچیاں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اور امہات المؤمنین رضی اللہ عنہن کو follow کریں اور ان کے گروپ میں شامل ہونے کی دعائیں کریں۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان باتوں پر صحیح معنوں میں عمل کرنے اور اسلام کے اصولوں کے مطابق اپنی زندگیاں گزارنے کی توفیق عطا فرمائے اور ہمارا خاتمہ ایمان پر کرے۔ آمین!

Jan 2019
Vol.68
Regd. CPL No.115
No.1
Monthly Meesaq Lahore